التفسیر، مجلس تفسیر، کراچی جلد ۶، شمارہ ۱۸، اپریل تا ستمبر ۲۰۱۲ء

مولانا سعید احمد اکبر آبادیؒ کے تعلیمی افکار

ڈاکٹر حمیرا ناز

Muslim leaders of sub continent had performed the duty of ideological and epistemological guidance against the colonial power of British Empire through their knowledge, wisdom and action in every walk of life for the revival and restoration of Islamic civilization, and made a history which will no doubt be written in golden words in the history of sub continent, of course it is matter of proud for the Muslim population of Sub Continent. Among these great scholars, leaders of Ummah and history maker personalities, the name of Molana Saeed Ahmed Akber Abadi can not be ignored who played very prominent role in re awakening of the Ummah through their writings and authorship. His major

achievement in this regard was the establishment of NADWATUL MUSANIFFIN furthermore he guided Muslim Ummah through its representative magazine BURHAN in the field of education as well. He wrote long and short essays in BURHAN on educational themes to create educational awareness among Muslim. In present essay, we have collected and compiled his essays on the theme of education and try to evaluate the depth and breadth of his educational views, for which he is placed on seat of great theologian, reformist and educationalist.

ہندوستان میں برطانوی استعمار کے عزائم اور مقاصد سیاسی بھی تھے اور تہذیبی بھی۔ سیاست پر غلبہ وتسلط کے بعد برطانوی حکومت نے تہذیبی اور تعلیمی شعبے کو ہدف بنایا اور ایک نئی زبان، نئی تہذیب اور ایک نئے ثقافتی کلچر کو فروغ دیا جس کا بنیادی مقصد اسلام کو ضعف پہنچانا اور عیسائیت کو تقویت دینا تھا۔اس مقصد کے تحت ایک طرف انگریز حکومت نے ایک ایسا نظام تعلیم اور نصاب وضع کیا، جس کے ذریعے مسلمانوں کے ذہنوں میں اُن کی اپنی تہذیب وتمدن کے بارے میں تشکیک اور مغرب اور مغربی تہذیب کے بارے میں مرعوبیت پیدا کرنا تھا تو دوسری طرف عیسائی مشنری اداروں کی سرپرستی کے ذریعے عیسائیت کو فروغ دینا تھا۔

تاہم یہ ایک خوش آئند حقیقت ہے کہ مسلمان علماء ومفکرین اور تعلیمی ماہرین نے برطانوی استعمار کے مذموم مقاصد کا صحیح ادراک کیا اور اس کے تدارک کے لئے ٹھوس اقدامات کئے ۔ اس حوالے سے مسلم یونیورسٹی علی گڑھ، دارالعلوم دیوبند، ندوۃ العلماء، جامعہ ملّیہ، دارالمصنفین اور ندوۃ المصنفین اسی طرح کے بیسیوں ادارے ہیں جنہوں نے برطانوی استعمار کے خلاف علمی جدوجہد کی تاریخ رقم کی۔

اس علمی جد وجہد میں ایک نام مولانا سعید احمد اکبر آبادی (۱۹۰۸ء-۱۹۸۵ء) کا بھی ہے۔ جنہوں نے اپنے قلم و افکار کے ذریعے ملتِ اسلامیہ ہند کی نازک وقت میں رہنمائی کی۔ مولانا سعید احمد اکبر آبادی عصر حاضر کے ایک بڑے عالم اور علوم اسلامیہ پر غائر نظر رکھنے والے علمائے اسلام میں سے تھے۔ مولانا کے تحصیل علم کا سفر دینی درسگاہوں سے لے کر عصری جامعات تک پھیلا ہوا ہے۔ وہ ایک طرف دارالعلوم دیوبند سے وابستہ تھے تو دوسری طرف ان کا تعلق جدید علمی مراکز سینٹ اسٹیفن کالج اور خاص طور پر علی گڑھ مسلم یونیورسٹی سے تھا۔ اس طرح قدیم و جدید کے علم کا امتزاج اور ہم آہنگی نے اُن کی شخصیت کو ایک امتیازی مقام عطا کیا، جو آپ کی تحریروں میں نمایاں ہے۔

مولانا سعید احمد اکبر آبادی ایک کثیر الجہت سیرت و شخصیت کے مالک تھے۔ آپ ایک طرف بلند پایہ عالم دین، محقق، ادیب، مؤرخ اور مدرس و خطیب تھے تو وہیں آپ کی شخصیت کا ایک پہلو ایک مفکر اور مصلح کا بھی ہے۔ آپ نباضِ وقت، خیر خواہِ قوم و ملت اور عصر حاضر کے مسائل و تقاضوں کا گہرا ادراک و شعور رکھنے والے باکمال اور نابغہ روزگار شخصیت بھی تھے۔ آپ کا شمار ہندوستان کے اُن اکابرین میں ہوتا ہے۔ جنہوں نے مسلمانوں میں تعلیمی شعور کو اُجاگر کرنے کے لئے اپنے رفقاء (مفتی عتیق الرحمن عثمانی اور مولانا حفظ الرحمن سیوہاروی) کے ساتھ مل کر ایک علمی اور تحقیقی ادارے "ندوۃ المصنفین" کی بنیاد ڈالی اور اس کے ترجمان رسالے برہان کے ذریعے مسلمانوں کی علمی و فکری تربیت اور رہنمائی کا سامان مہیا کرنے کی کوشش کی تاکہ اُن میں حقیقی فکر و عمل کی استعداد پیدا کر کے انہیں روشن دماغ قوم بنایا جا سکے [2]۔ کیونکہ آپ اس بات سے آگاہ تھے کہ مسلمان زندگی کے تمام شعبہ جات میں پیچھے ہیں بالخصوص علمی اور اقتصادی میدان میں۔ لہٰذا اس بناء پر یہ بات عیاں تھی کہ مسلمان اس ملک کے آئندہ سماجی جسم کے ایک مضبوط اور توانا عضو کی حیثیت سے اُس وقت تک ہرگز نہیں رہ سکتے جب تک کہ ان کو اولاً تعلیم اور اقتصادی میدان میں اپنے برادرانِ وطن کے ساتھ چلنے کے قابل نہ بنا دیا جائے گا [3]۔ اسی لئے آپ تعلیم کے شعبے میں بے لاگ اصلاحات کے خواہاں تھے۔ اور اسے عصری

تقاضوں سے ہم آہنگ کرنے کی ضرورت محسوس کرتے تھے۔ چنانچہ مولانا اکبر آبادی نے تعلیمی شعبے کی مجموعی صورتِ حال کا جائزہ لیا اور تعلیمی شعبے کی خامیوں اور خامیوں کی نشاندہی کی اور تعلیمی مبادیات و مباحث کے تمام جزو کل کو وقت کے حالات و تقاضوں کی روشنی میں پیش کیا۔ مولانا اکبر آبادی نے برہان میں تعلیمی موضوعات پر طویل اور مختصر مضامین اور مقالات تحریر کئے اور ان مقالات و مضامین میں مولانا نے تعلیمی مبادیات، مقاصدِ تعلیم، نظام و نصابِ تعلیم، تعلیمی مسائل، قومی تعلیمی پالیسی کو موضوع بحث بنایا ہے ہم ذیل میں مولانا کے ان ہی تعلیمی افکار کا جائزہ لیں گے۔

مقاصدِ تعلیم

تعلیمی شعبے کی اصلاح و تعمیر کے حوالے سے مولانا اکبر آبادی کے نزدیک درج ذیل اولین اساسی مقاصد تھے:

(ا) مسلمانوں کو جدید علوم و فنون کی تحصیل کی طرف راغب کرنا، اُن میں تصنیف و تالیف کی اہمیت کو اُجاگر کرنا اور علمی و ادبی ورثہ کے تحفظ اور ترقی کی جانب متوجہ کرانا آپ کے تعلیمی مقاصد میں شامل تھا [4]

(ب) عربی زبان کی ترویج و اشاعت بھی آپ کے نزدیک اہم تھی [5]

(ج) تعلیم کا اصل منشاء بتا کر ذہن و دماغ کی صحیح تربیت، استوار ذہنیت کا پیدا کرنا اور کیریکٹر بنانا بھی آپ کا مقصود تھا۔ لیکن اس کے لئے آپ علمائے کرام کی ذمہ داری سمجھتے تھے [6]

(د) علمی ذوق کو پروان چڑھانے کے لئے مسلمانوں کو علمی تحقیق و تفتیش کی طرف راغب کرانا بھی آپ کے پیش نظر تھا۔ [7]

مقاصدِ تعلیم۔ تشریح و توضیح:

مولانا اکبر آبادی نے مذکورہ بالا مقاصد کی تشریح و توضیح بھی کی اور ہر ایک کی وضاحت بھی کی ہے۔

(ا) علمی و ادبی متروکات کی حفاظت اور جدید علوم وفنون کی تحصیل:

مولانا اکبر آبادی نے مسلمانوں کو زندہ قوم بننے کے لئے اپنے پرانے سرمایہ علوم و فنون کی حفاظت اور دوسری جانب جدید علوم وفنون اور عصری ادبیات میں زیادہ سے زیادہ کمال پیدا کر کے اپنے ملکی ذخیرہ ادب کو ترقی یافتہ بنانے اور اسے وسیع سے وسیع تر بنانے پر زور دیا[8]۔ کیونکہ آپ کی نظر میں یہی اقوام عالم کی ترقی کا راز ہے اور اسی پر تہذیبی اور ثقافتی عظمت کا دارومدار بھی ہے[9]۔ لہٰذا اس کی اہمیت کے پیش نظر آپ نے اپنے قدیم سرمایہ علوم وفنون کی حفاظت کا بندوبست کرنے کے لئے چند تجاویز بھی دی ہیں۔ (۱) آپ نے اس کے لئے عزم و حوصلہ کے ساتھ اُن کی تعلیم کے لئے مدارس قائم کرنے پر زور دیا (۲) اور ساتھ ہی کتابوں کی اشاعت کا زیادہ سے زیادہ اہتمام کرنے کی بھی رائے دی ہے[10]۔ اور اس ضمن میں آپ نے اجتماعی کوششوں کو سودمند قرار دیا اور اس کے لئے مسلمانوں کو ملی تنظیم وتعمیر کا ایک ہمہ گیر پروگرام بنا کر اس کام کو شروع کرنے کا مشورہ دیا ہے۔ اس سلسلے میں آپ کا کہنا تھا کہ عربی، فارسی، اُردو کی پرانی کتابوں کو زیادہ سے زیادہ چھاپنے کا بندوبست کیا جائے اور جو انفرادی طور پر یہ کام کرنا چاہیں تو اس سلسلے میں آپ نے متمول ارباب مطبع کو بھی پرانی کتابوں کی طباعت کا زیادہ سے زیادہ انتظام کرنے کی رائے دی ہے[11]

(ب) عربی زبان کی ترویج و اشاعت:

عربی زبان کی اہمیت بیان کرتے ہوئے آپ کا کہنا ہے کہ عربی زبان کو اسلامی کلچر، اسلامی تہذیب، اسلامی روایات کے ساتھ گہرا تعلق ہے[12]۔ لہٰذا آپ سمجھتے ہیں کہ اگر ہمارا کلچر محفوظ رہے، ہماری روایات زندہ رہیں اور ہماری زندگی میں اسلامیت کا عنصر نمایاں ہو تو آپ کی نظر میں اس کے لئے ہندوستان میں عربی زبان کی ترویج و اشاعت اور اس کی ترقی وتہذیب کے لئے زیادہ سے زیادہ کوششیں کرنا ناگزیر ہوگا۔[13]

عربی زبان کی اس اہمیت کے پیش نظر عربی زبان کی ترقی کا مسئلہ جس قدر اہم اور توجہات کا مستحق تھا مدارس کا اس سے تغافل اور بے پرواہی کا عملاً ثبوت دینے پر آپ نے

افسوس کا اظہار کیا ہے۔ آپ کا کہنا ہے کہ آج ہندوستان کے شہر شہر اور قریہ قریہ میں عربی کی ایک دو نہیں کئی درسگاہیں قائم ہیں۔ جہاں جوق درجوق طلباء سات سات، آٹھ آٹھ سال علوم عقلیہ ونقلیہ کی تعلیم عربی زبان میں حاصل کرتے ہیں پھر ان علوم میں عربی ادب کا بھی کافی حصہ ہوتا ہے اور افصح العرب والعجم کا کلام بلاغت التیام بھی کہ رسہ کرر پڑھا جاتا ہے لیکن ان ہزاروں ہزار عربی پڑھنے والوں میں بہت کم ایسے ہوتے ہیں جن کو واقعی عربی زبان آتی ہے اور جو واقعی عربی کا صحیح مذاق رکھتے ہوں، اس میں تقریر کر سکتے ہوں اور تحریر لکھ سکتے ہوں۔ مولانا یہ بھی کہتے ہیں کہ اگر کسی انگریزی کالجوں میں پڑھنے والے طلباء کو عربی نہیں آتی تو ہم کو ان سے زیادہ شکوہ سنج ہونے کی ضرورت نہیں کیونکہ ان لوگوں کو عربی محض ضمنی طور پر پڑھائی جاتی ہے البتہ اُن حضرات کی طرف سے کیا معذرت پیش کی جاسکتی ہے جو کئی کئی سال محض عربی میں تعلیم پاتے ہیں اور پھر بھی عربی کی ایک سطر صحیح لکھنے یا ایک جملہ بولنے کی بھی ان میں قدرت نہیں ہوتی ہمیں اپنی اس کوتاہی کا احساس اُس وقت زیادہ ہوتا ہے جبکہ مصر وشام کا کوئی عالم کسی عربی مدرسے میں پہنچ جاتا ہے اُس وقت ارباب مدرسہ کی حیرانی و پریشانی قابل دید ہوتی ہے۔ عام طلباء کا کیا ذکر، مدرسے کے بڑے بڑے اساتذہ بھی اس مصری یا شامی مہمان سے عربی میں گفتگو کرتے ہیں تو بہت رک رک کر، اور ڈر ڈر کر اور اکثر جملے زبان سے غلط نکل جاتے ہیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ یہ حضرات ہندوستان کے علماء کی نسبت کوئی اچھا خیال لے کر واپس نہیں جاتے۔[14] لہٰذا آپ سمجھتے ہیں کہ اگر ان مدارس میں عربی ادب کی تعلیم کا صحیح انتظام ہوتا اور ان کے ذریعے ملک میں عربی زبان کی ترویج واشاعت کا کام بھی انجام پا سکتا تو آج ہندوستان کے مسلمانوں کی وہ حالت نہ ہوتی جو آج ہے اور نہ ہی یہاں کے انگریزی تعلیم یافتہ احباب کو اسلام اور اسلامیات سے اتنا بعد ہوتا جتنا کہ آج دیکھا جارہا ہے۔[15]

(ج) تعلیمی ترقی و اصلاح۔ علمائے کرام کی ذمہ داری:

مولانا تعلیمی ترقی و اصلاح کے لئے علمائے کرام کے کردار کو کلیدی قرار دیتے ہیں آپ کے خیال میں علمائے کرام ہی مسلمانوں میں صحیح مذہبی وسیاسی فکر پیدا کر سکتے ہیں اور اس

ضمن میں آپ لٹریچر کی تیاری کو نہایت اہم سمجھتے ہیں [۱۴]۔ مولانا اکبر آبادی نے علمائے کرام کے سامنے ترقیاتی کاموں کا ایک جامع منصوبہ بھی پیش کیا جو درج ذیل نکات پر مشتمل ہے:

۱۔ مدارس عربیہ کے نصاب کی اصلاح کرکے جدید علوم وفنون کو اس میں داخل کرنا۔

۲۔ تعلیم کے لئے ایسے اساتذہ کا انتخاب کرنا جو علوم وفنون میں مہارت کے ساتھ طلباء کی دماغی تربیت کرکے اُن میں مضبوط کیریکٹر بھی پیدا کرسکیں۔

۳۔ عوام کی تعلیم کا بندوبست کرنا، بالخصوص دیہاتوں میں جابجا مفید نصابِ تعلیم کے مدارس و مکاتب جاری کرنا۔

۴۔ ملک میں مذہبی و سیاسی لٹریچر بیش از بیش مہیا کرنا اور کثرت سے اس کو شائع کرنا۔

۵۔ مسلمانوں میں فوجی اسپرٹ اور صحت وتوانائی جسمانی پیدا کرنے کے لئے قریہ بقریہ شہر بشہر ورزش گاہیں قائم کرانا کہ انسان کا جسم تندرست ہوتا ہے تو اس کے خیالات میں بھی علو پیدا ہوتا ہے۔

۶۔ مسلمانوں کا ایک بیت المال قائم کرکے غریب ومفلوک الحال مسلمانوں کے لئے ذرائع معاش مہیا کرنا۔

۷۔ مدارس عربیہ کے علاوہ کالجوں اور یونیورسٹیوں پر قبضہ جماکر وہاں کے طلبہ میں صحیح اسلامی تخیل اور خوب قوی پیدا کرنا۔

۸۔ فضول اور لایعنی رسوم بند کرانے کے لئے محلہ بہ محلہ ایک کمیٹی بنانا کہ وہ اہل محلہ کی نگرانی کرے اور اُن کو فضول ولغو باتوں سے بچائے۔

۹۔ مسجدوں میں ایسے اماموں کا تقرر کرانا جو عالم باعمل اور جدید ضرورتوں سے باخبر ہوں اور وہ ہفتہ میں کم ازکم ایک مرتبہ نو بہ نو مسائل پر مسلمانوں کے سامنے وعظ کہہ سکیں۔

۱۰۔ ملک میں ایسا اسلامی پریس مہیا کرنا جو مسلمانوں کی صحیح نمائندگی اور اُن میں دل و دماغ کی صحیح بیداری پیدا کرے۔ یہ پریس اُردو اور انگریزی دونوں میں ہونا چاہیے۔ [۱۵]

(د) مطالعہ وتحقیق کی ضرورت:

مولانا اکبر آبادی مسلمانوں میں تعلیمی انحطاط کی بنیادی وجہ مطالعہ وتحقیق کے نقدان کو قرار دیتے ہیں آپ کی نظر میں یہ نقدان قدیم اور جدید دونوں طبقوں میں پایا جاتا ہے مولانا نے علمی ذوق کے اس انحطاط ونقدان کے اسباب وعوامل کی نشاندہی بھی کی اور اس کی اصلاح کے لئے چند تجاویز بھی دی ہیں۔ آپ کے خیال میں اس علمی ذوق کے انحطاط ونقدان کی درج ذیل وجوہات ہیں:

۱۔ اعلیٰ تعلیم یافتہ لوگوں میں خالص علمی ذوق کا مطالعہ اور شوق نہ ہونے کی وجہ مولانا کے خیال میں ان لوگوں کے پیش نظر اعلیٰ ڈگریاں حاصل کرنے کے بعد آئندہ زندگی کے لئے بہتر سے بہتر راہ اختیار کرنے پر ہوتی ہے اور ان کی ساری علمیت اور قابلیت اسی کے لئے وقف رہتی ہے اور ان کو اس کی ضرورت ہی نہیں رہتی کہ وہ اپنے اوقات کا ایک قلیل حصہ اپنے ملک کے سنجیدہ اور ٹھوس علمی لٹریچر کے مطالعے کے لئے وقف کرے۔ [۱۶]

۲۔ پھر آپ نے کالجوں اور یونیورسٹیوں کے پروفیسر جو بڑی بڑی تنخواہیں پاتے ہیں اور جن کی زندگیاں خالص علم کی خدمت کے لئے وقف ہونی چاہیے ان میں بھی علمی مطالعہ اور تحقیق کا ذوق نہ ہونے کی وجہ آپ نے ان میں عدم دلچسپی کا پایا جانا قرار دیا ہے۔ ان پروفیسرز کے بارے میں آپ کا کہنا ہے کہ جن کی زندگیاں خالص علم کی خدمت کے لئے وقف ہونی چاہیے تھیں اُن میں سے اکثر کا شب و روز اس طرح بسر ہوتا ہے کہ وقت مقررہ پر کلاس روم میں گئے اور اپنی یادداشتوں کی مدد سے جو کچھ انہیں پڑھانا ہے وہ پڑھا دیا۔ اس کے بعد ان کو نہ علمی مطالعے سے کوئی واسطہ اور نہ اپنے ہی مضمون پر تحقیق کرنے سے سروکار، تعلیم وتدریس کے گھنٹوں کے علاوہ ان کے تمام اوقات دوست احباب کی ملاقاتوں، خوش گپیوں اور تفریحات کے لئے وقف رہتے ہیں۔ آپ کو ہندوستان میں کتنے ہی پروفیسر ملیں گے جو بڑی بڑی نامور یونیورسٹیوں میں مختلف مضامین کے استاد ہیں مگر جب کبھی اپنے قلم کی روانی دکھانے

کا جذبہ پیدا ہوتا ہے تو اس کے لئے وہ ہمیشہ "افسانہ نگاری" یا "نظم گوئی" کا میدان تلاش کرتے ہیں۔[۳۹]

۳۔ اسی طرح قدیم تعلیم یافتہ طبقے میں مطالعہ وتحقیق کے فقدان کی وجہ مولانا کی نظر میں یہ ہے کہ ان حضرات کا درس و افتاء کی چہار دیواری اور ظواہر احکام کے حصار میں مقید ومحدود رہنا ہے[۴۰]۔ چونکہ ان کی پڑھنے اور پڑھانے کی محدود دنیا ہوتی ہے اور اُنہیں اس کی خبر نہیں ہوتی کہ باہر دنیا میں علمی کارناموں کی رفتار کیا ہے اور نہ ہی اپنے اسلاف کے علمی تحقیق وتلاش کے سلسلے میں عظیم الشان کارناموں کی خبر ہوتی ہے اور نہ ہی اُنہیں یہ معلوم ہوتا ہے کہ ہندوستان میں کتنے تصنیفی ادارے ہیں اور وہ کیا کیا کام کر رہے ہیں۔[۴۱]

مولانا اکبر آبادی نے علمی ذوق اور مطالعہ وتحقیق کے کاموں میں عدم دلچسپی کی اور دوسری وجوہات بھی بیان کی ہیں۔ آپ کا کہنا ہے کہ:

ا۔ انہی لوگوں میں بڑی اچھی استعداد رکھنے والے بھی ہوتے ہیں لیکن ماحول ایسا بن گیا ہے کہ یہ لوگ اپنی استعداد سے کام لے کر نہ اپنے اوقات کو علمی تحقیق وتفتیش میں صرف کر سکتے ہیں اور نہ وہ اپنے علمی ذوق کو پروان چڑھا سکتے ہیں۔ کیونکہ مولانا کا کہنا ہے کہ اگر کوئی مدرس ہے تو اسے دن بھر میں آٹھ آٹھ نو نو مختلف مضامین کے سبق پڑھانے ہوتے ہیں پھر چونکہ تنخواہ کم ہوتی ہے۔ اس بناء پر اخراجات پورا کرنے کے لئے درس کے علاوہ کوئی اور دھندا بھی کرنا پڑتا ہے ظاہر ہے کہ پھر ایسا مصروف شخص اتنا وقت کہاں سے لاسکتا ہے کہ وہ غیر درسی کتابوں کا مطالعہ بھی کرے اور اس کے ذریعے فنی کمال پیدا کرے۔[۴۲]

۲۔ علمی ذوق کے انحطاط وتنزل میں بڑا دخل مولانا اکبر آبادی نے اُن فلم کمپنیوں اور شاعروں کی کثرت کو بھی کہا ہے جنہوں نے فنی شاعری کو تباہ کیا ہے۔ ان کے بارے میں مولانا کہتے ہیں کہ جہاں دو چار شعر اُلٹے سیدھے موزوں کر دینے کے بعد

حسن ترنم سے مشاعرہ میں ان کو پڑھ دینے سے یا کسی فلم کمپنی میں بہت ہی ارزاں قسم کے گیت اور غزلیں لکھ دینے سے شعروں کو داد ملنی شروع ہوئی اور شاعر نے سمجھ لیا کہ وہ فن کے کمال تک پہنچ چکا ہے اور اب اس کو کوئی غرض نہیں ہوتی کہ فن کا مطالعہ کرے، اساتذہ سے استفادہ کرے، ان کے شعری مجموعوں سے اپنے فن میں نکھار لائے اور اصول فن کا پابند رہ کر مشق سخن بہم پہنچائے۔[۴۳]

۳۔ اس کے علاوہ مولانا کے خیال میں ہر مسجد میں ترجمہ قرآن مجید، مذہبی جلسوں کی بھرمار، کچھ نیم سیاسی انجمنوں کی سرگرمیاں ان سب کو بھی علمی ذوق کے انحطاط و تنزل میں بہت بڑا دخل ہے۔[۴۴]

مولانا اکبر آبادی نے اس علمی انحطاط وتنزل کی نشاندہی کر کے جس کی رفتار آپ کی نظر میں نہایت ہی خطرناک ہے فوری طور پر اس کی اصلاح کی جانب توجہ مبذول کرائی ہے کیونکہ آپ اس حقیقت سے آگاہ تھے کہ اگر اس کی اصلاح کی طرف توجہ نہیں کی گئی تو عین ممکن ہے کہ ایک وقت ایسا آجائے کہ ہمارے اسلاف کرام کے علمی خزانے تاریخ کا ایک گم شدہ یا فراموش کردہ ورق ہو کر رہ جائیں اور کوئی بھی ایسا نہ نکلے جو ان کے نام سے بھی آشنا ہو اس صورت حال کو آپ قوم وملت کی تہذیب اور اس کے کلچر کی موت کہتے ہیں۔ کیونکہ آپ کی نظر میں ایک قوم کے کلچر اور اُس کا سرمایہ علمی کی موت خود اس قوم کی موت ہے۔[۴۵]

لہٰذا ایسے موقع پر آپ علمائے کرام اور ارباب حل وعقد دونوں کا فرض سمجھتے ہیں کہ وہی اس کے تحفظ اور بچاؤ کا سروسامان کر سکتے ہیں اور اس کا حل تلاش کر سکتے ہیں آپ نے اس کے لئے مختلف تجاویز بھی دی ہیں آپ کا کہنا ہے کہ:

ا۔ دارالعلوم دیوبند اور ندوۃ العلماء لکھنو ایسی درس گاہوں میں اسلامی تحقیقات کا ایک مستقل شعبہ قائم کیا جائے جس میں اسلامی علوم وفنون کی مطبوعہ اور غیر مطبوعہ کتابوں کا بڑے سے بڑا ذخیرہ فراہم کیا جائے اور فارغ التحصیل طلباء میں سے دو چار ہونہار، ذہین محنتی اور صاحب ذوق طلباء کا انتخاب کر کے ان سے کسی بڑے عالم اور محقق کی

نگرانی میں اس شعبہ میں کام کرایا جائے۔ ہر طالب علم کو کم ازکم سو روپیہ ماہوار وظیفہ دیا جائے اور اس کے ذوق اور صلاحیت کے مطابق کسی ایک موضوع کا انتخاب کرکے اس پر اس سے ریسرچ کرائی جائے اور اس شعبے میں کام کرنے کی مدت کم ازکم تین سال رکھی جائے۔

۲۔ اس کے علاوہ آپ اس کی بھی ضرورت سمجھتے ہیں کہ سال بھر میں کم ازکم ایک مہینے کے لئے مدارسِ عربیہ کا کسی جگہ پر سیمینار منعقد کرایا جائے جس میں مختلف علوم وفنون کے ماہر اساتذہ شریک ہوکر مختلف مباحث پر لیکچر دیں، بحث و مباحثہ اور مذاکرہ کریں اور اس طرح طلباء میں علمی ذوق کی تربیت اور اس کی آبیاری کریں۔[۲۶]

۳۔ اس کے ساتھ ساتھ مولانا اکبر آبادی اسلامی تحقیقات کے سلسلے میں تین عنوانوں پر کام کرنا زیادہ اہم سمجھتے ہیں جن میں تاریخ اسلام، فلسفہ اسلام اور اسلامی دینیات شامل ہیں۔مولانا اکبر آبادی اس کی اہمیت یہ بتاتے ہیں کہ یونیورسٹیوں میں مذکورہ بالا تین مضامین کے جو پرچے ہوتے ہیں ان کی تیاری کے لئے ہمارے نوجوان طلباء و طالبات اور اساتذہ سب اُن کتابوں پر اعتماد کرنے کے لئے مجبور ہیں جو یورپ اور امریکہ میں لکھی گئی ہیں مولانا کا ماننا ہے کہ مستشرقین یورپ کا علمی ذوق، محنت وجستجو، ترتیب مواد اور تصنیف وتحقیق کی صلاحیت و استعداد سب اپنی جگہ مسلم ہیں لیکن چونکہ اُن کا نقطۂ نظر اسلامی نہیں ہوتا اور وہ اسلامی احکام ومسائل کی اصل اسپرٹ سے براہِ راست واقف نہیں ہوتے اس بناء پر ان کی تحقیق کے جو نتائج ہمارے سامنے آتے ہیں وہ بسا اوقات صحیح نہیں ہوتے اور ان سے طرح طرح کی غلط فہمیاں اور بدگمانیاں پیدا ہوجاتی ہیں اس بناء پر اس بات کی سخت ضرورت ہے کہ صحیح الخیال محقق مسلمان اسلامی تاریخ وفلسفہ اور اسلامی دینیات پر خود انگریزی میں کتابیں لکھیں تاکہ تصویر کا صحیح رُخ سامنے آسکے اور یہ کام ایک دو سال کا نہیں بر سوں کا ہے اور ایک دو آدمیوں کے کرنے کا نہیں بلکہ پوری ایک جماعت یا بورڈ کے کرنے کا ہے اور پھر ضمنی طور پر کرنے کا نہیں بلکہ مستقل طور پر ایک اصلی اور بنیادی

حیثیت سے انجام دینے کا ہے۔[۲۷]

مقاصدِ تعلیم کے ذیل میں مولانا اکبر آبادی نے جن ترجیحات کی نشاندہی کی ہے اُس کو وقت اور حالات کے تناظر میں دیکھنے کی ضرورت ہے۔مولانا اکبر آبادی بحیثیت ماہر تعلیم کے تعلیم کے مسلمہ مقاصد سے بخوبی واقف تھے وہ اچھی طرح جانتے اور سمجھتے تھے کہ تعلیم کا بنیادی مقصد کیا ہے اس کا اظہار زیرِ نظر موضوع کی آئندہ سطور میں بھی آرہا ہے تاہم مولانا نے صرف اُن تعلیمی مقاصد کی نشاندہی کی ہے جو اُس وقت کی ضرورت تھی۔

تعلیمی خائص ومسائل اور اس کا حل

مولانا نے ہندوستان کے تعلیمی خائص بالخصوص مسلمانوں کے تعلیمی مسائل کو موضوعِ بحث بنایا ہے جس کا ذیل میں ہم جائزہ لیں گے۔

(ا) مدارسِ عربیہ۔ نصاب اور طریقہ تدریس:

مولانا اکبر آبادی نے اپنے تعلیمی افکار میں مدارسِ عربیہ کے نظامِ تعلیم اور نصاب پر بھی تنقیدی نظر ڈالی ہے انہوں نے بُرہان کے متعدد شمارے اور چار قسطوں پر مشتمل اپنے طویل مقالہ (مدارسِ عربیہ کے لئے ایک لمحۂ فکر) میں مدارسِ عربیہ میں موجودہ خائص کی نشاندہی کرتے ہوئے اس کی اصلاح اور بہتری کی تجاویز پیش کی ہیں۔ کیونکہ مولانا طویل عرصہ سے مدارسِ عربیہ کے تعلیمی نظام کی اصلاح کی ضرورت محسوس کررہے تھے ہر چند کہ آپ کو اس امر کا احساس اور اندازہ تھا کہ علماء کا ایک طبقہ مدارس کے نظامِ تعلیم میں ترامیم اور اصلاح کو قبول نہیں کرے گا لیکن آپ نے نہایت حوصلہ مندانہ طریقے سے قلم اُٹھایا اور اپنا نقطۂ نظر پیش کیا۔

ا۔ اس ضمن میں مولانا اکبر آبادی نے سب سے پہلے تعلیم کے قدیم اور جدید تقسیم کے اسباب وحرکات کا تجزیہ کیا ہے آپ کے خیال میں انگریزوں کے اقتدار سے پہلے جو مدارسِ عربیہ تھے اُن کے طریقہ تعلیم میں ہمہ گیری اور جامعیت پائی جاتی تھی۔وہ آج کل کی یونیورسٹیوں اور کالجوں سے کسی طرح بھی کم نہ تھے ان مدارس میں تعلیم کا مقصد جس طرح دینی ہوتا تھا علمی بھی ہوتا تھا اور دنیوی بھی ہوسکتا تھا۔ اس میں نہ قدیم وجدید کی کوئی تفریق تھی اور نہ مولوی اور غیر مولوی کا کوئی جھگڑا تھا، ملک کے

تمام لوگ صرف دو ہی طبقوں پر منقسم تھے، ایک تعلیم یافتہ اور دوسرا غیر تعلیم یافتہ ، آج کل کی طرح یہ اندھیر نہیں تھا کہ تعلیم یافتہ ہونے پر بھی یہ بتانا پڑتا ہے کہ تعلیم یافتہ لوگوں کے کس طبقہ اور کس گروہ سے یعنی قدیم سے یا جدید سے تعلق رکھتا ہے جس طرح آج جدید تعلیم یافتہ کے معنی بہت وسیع ہیں جس میں انجینئر ، ماہر طبعیات، ڈاکٹر ، وکیل غرض کہ سائنس اور آرٹ کے کسی شعبے کے گریجویٹ سب تعلیم یافتہ کہلاتے ہیں اور ان میں کوئی تفریق نہیں ہوتی ٹھیک اسی طرح مسلمانوں کے عہد حکومت میں علوم دینیہ اور علوم وفنون غیر دینیہ سب کے جاننے والوں کو علماء کہتے تھے لیکن جس طرح مطلق تعلیم یافتہ ہونے کے بعد خاص خاص علوم وفنون میں کمال و مہارت کے اعتبار سے اس علم کی طرف نسبت کرکے ہر ایک کا جدا جدا نام ہوتا ہے مثلاً فلسفہ کے ماہر کو فلسفی (فلاسفر)، منطق کے فاضل کو منطقی (لوجیشین)، سائنس کے باکمال کو سائنٹسٹ کہتے ہیں اسی طرح زمانہ زیر بحث میں حدیث کے مبصر کو محدث، تفسیر کے فاضل کو مفسر، علم کلام کے ماہر کو متکلم اور تاریخ کے امام کو مورخ کہتے تھے۔ان مدارس کے فارغ التحصیل علماء میں جہاں محدث، مفسر، فقیہ اور مفتی ہوتے تھے بعض مورخ، فلسفی، ماہر طبعیات، طبیب اور ماہر ریاضیات بھی ہوتے تھے ان میں سے بعض درس وتدریس اور فقہ وافتاء کے مسند کی رونق بنتے تھے تو اُن ہی میں کچھ ہوتے تھے جو امارت ووزارت اور حکومت کے دوسرے شعبوں کی ذمہ داری اٹھاتے تھے۔پھر شاعر، ادیب اور مصنف بھی اُن ہی میں سے اٹھتے تھے اور مبلغ وخطیب اور کاتب بھی اُن ہی میں ہوتے تھے یہی وجہ ہے کہ ہندو بھی ان مدارس میں مسلمانوں کے ساتھ تعلیم پاتے تھے اس سے یہ صاف ظاہر ہے کہ مدارس عربیہ کا مقصد وجود صرف دینی نہیں بلکہ علمی بھی ہوتا تھا اور حکومت کی ملازمت اور عہدے وغیرہ بھی اُن ہی مدارس میں تعلیم پانے کے بعد حاصل ہوتے تھے۔[۲۸] لیکن برطانوی راج کے قائم ہوجانے کے بعد مدارس عربیہ کے نظام کا شیرازہ پراگندہ ہوگیا اور وہ ہمہ گیری نہیں رہ سکی جو پہلے تھی اور اس کا لازمی نتیجہ یہ ہوا کہ تعلیم قدیم وجدید دو حصوں میں

تقسیم ہوگئی اور اس طرح تعلیم یافتہ مسلمان دو مخالف ومتضاد گروہوں میں بٹ گئے۔ آپ کے نزدیک یہ ایک دوسرے کے حلیف نہیں بلکہ حریف بن گئے جس کی وجہ سے مدارس عربیہ کا نظام عمل صرف دینی اغراض تک محدود ہوکر رہ گیا[۲۹]۔ مولانا مدارس عربیہ کے نظام عمل کو دینی اغراض تک محدود ہونے کی وجہ طبعی اور قدرتی بھی سمجھتے ہیں[۳۰]۔آپ کا کہنا ہے کہ انقلاب حکومت کے خطرات کا سدباب کرنے کے لئے علمائے کرام دین کے تحفظ کے لئے مدارس عربیہ کا قیام عمل میں لے کر آئے۔ لیکن اس سے ان کے نصاب وطریقہ ہر چیز کا مقصد صرف دین اور اس کا تحفظ ہوگیا اور مدارس عربیہ سے جو علمی یا دنیوی فوائد پہلے حاصل کئے جاتے تھے وہ نا قابل اعتنا ہوگئے اور اس کے مقاصد میں جو جامعیت اور ہمہ گیری تھی وہ ختم ہوگئی[۳۱]۔ لیکن ان سب فروگزاشتوں اور کوتاہیوں کے باوجود مدارس عربیہ نے ہندوستان میں دین وعلم کی جو خدمات انجام دیں آپ اُن کو شاندار اور قابل قدر کہتے ہیں۔لیکن ان کی عظمت کا صحیح اندازہ بقول مولانا اکبر آبادی اُس وقت ہوسکتا ہے جبکہ ہندوستان کے مسلمانوں کے علمی و مذہبی حالات کا موازنہ ومقابلہ اُسی زمانے کے ممالک اسلامیہ کے ساتھ کیا جائے[۳۲]۔مولانا جدید حالات اور قومی و بین الاقوامی انقلابات وتغیرات کے شدید تقاضے کو دیکھتے ہوئے مدارس عربیہ میں عہد جدید کے علمی تقاضوں کے مطابق نصاب وطریقہ تعلیم میں تبدیلی کرنے پر زور دیتے ہیں۔کیونکہ آپ کا کہنا ہے کہ آج یورپ اور امریکہ کے محققین نے اسلامی علوم و فنون سے متعلق جو کاوشیں کی ہیں انہوں نے اسلامی تاریخ، اسلامی فلسفہ، اسلامی فقہ اور اسلامی علم الکلام ان میں سے ہر چیز کے متعلق بحث و استدلال اور غور وفکر کے طریقے کو بدل دیا ہے اور اس میں اتنی وسعت پیدا کردی ہے کہ جب تک کوئی عالم اس طرز سے آشنا نہیں ہوگا وہ عملی طور پر اسلام کی خدمت ہرگز نہیں کرسکتا۔[۳۳]

۲۔ اسی طرح مولانا اکبر آبادی نے موجودہ درس نظامی کو بھی اُس کی موجودہ ہیئت دینی

اور عصری علوم دونوں کی تعلیم کے لحاظ سے سراسر ناقص اور مقاصد کے لئے غیر مفید قرار دیا ہے۔ غیر افادیت کی وجہ آپ کے نزدیک جس طرح نصاب تعلیم ہے، اس نصاب کا طریقہ تدریس بھی بڑی حد تک آپ کے خیال میں اس کا سبب ہے [۳۴]۔

لہٰذا آپ سب سے اہم اور مقدم کام طریقہ تدریس کی اصلاح کو سمجھتے ہیں آپ کا کہنا ہے کہ اس میں شک نہیں کہ املا کے طریقے پر درس دینے کا اہل ہر ایک مدرس نہیں ہوسکتا اور جو صاحب فن ہوگا وہ معمولی تنخواہ پر دستیاب نہیں ہوسکتا۔ اور پھر یہ بھی حقیقت ہے کہ ملک میں آج کل ایسے حضرات کا قحط بھی ہے لیکن آپ سمجھتے ہیں کہ اگر واقعی مدارس عربیہ میں اصلاح کرکے انہیں وقت کے تقاضوں کے مطابق مفید اور کارآمد بنانا ہے تو یہ سب کچھ اور اس کی تکمیل کے لئے جو اسباب طبعی ہوسکتے ہیں ان کا بندوبست کرنا ہی ہوگا۔ [۳۵]

۳۔ مدارس عربیہ کے نظام تعلیم سے متعلق ایک دوسرا مسئلہ نصاب تعلیم کا بھی ہے جس کی طرف آپ نے توجہ دلائی ہے کیونکہ مدارس عربیہ میں اصلاح نصاب کی ضرورت ایک مدت سے محسوس کی جارہی تھی۔ بعض مدارس اس سلسلے میں پہل کر چکے تھے۔ لیکن اصلاح نصاب سے متعلق علماء کی ایک بڑی تعداد اُن حضرات پر مشتمل تھی جو یا تو پرانے نصاب اور اس کے طرز تعلیم میں سرے سے کسی اصلاح وترمیم کی ضرورت کو محسوس ہی نہیں کرتے اور اگر کرتے بھی ہیں تو صرف اس قدر کہ ایک کتاب کی بجائے کوئی دوسری کتاب رکھ دی۔ نصاب میں کسی بنیادی اصلاح کی نہ ان کے ہاں ضرورت ہے اور نہ مناسب، بلکہ اس طرح کا اقدام کرنا ان کے نزدیک نامناسب اور مضر ہے [۳۶]۔ مولانا نے اصلاح نصاب سے متعلق اس غلط ذہنیت کی نشاندہی کرنے کے ساتھ ساتھ اس سلسلے میں جو اصلاح وترمیم کی ضرورت ہے اس پر بھی روشنی ڈالی ہے۔

درس نظامی جو تین قسم کے علوم وفنون پر مشتمل ہے (۱) علوم دینیہ [۳۷] (۲) علوم

آلیہ [۳۸] (۳) علوم عقلیہ [۳۹]۔ آپ نے ان کی تعلیم و اصلاح کے سلسلے میں مفید مشورے دیئے ہیں [۴۰]۔

۱۔ علوم دینیہ: اس کی تحصیل کے لئے آپ سب سے مقدم امر یہ سمجھتے ہیں کہ علوم دینیہ جس میں کتاب وسنت کے علاوہ فقہ اور اس کے متعلقات بھی شامل ہیں اور ہونا چاہئیں لیکن ان تینوں میں جو طبعی ترتیب ہے آپ کے خیال میں ان کے مطالعہ و درس میں بھی وہی ترتیب قائم رکھنی چاہیے اور ان تینوں میں جو فرق مراتب ہے ذہنی اور فکری طور پر اس فرق کو مرعی رکھنا چاہیے۔ نیز قرآن وسنت کی تعلیم وتدریس کے لئے آپ عربی زبان میں مہارت اس کے مختلف اسالیب بیان سے مکمل واقفیت اور زبان کے نکات ورموز کا ذوق ہونا بھی ناگزیر سمجھتے ہیں۔ [۴۱]

۲۔ علوم آلیہ: ان میں صرف ونحو، ادب، معانی وبیان، نیز بلاغت وبدیع شامل ہے۔ آپ کا کہنا ہے کہ ان میں ادب کا حال سب سے بدتر ہے۔ آپ یہ سمجھتے ہیں کہ ادب کے طالب علم کے لئے یہ ضروری ہوتا ہے کہ وہ تاریخ ادب سے اور علم اللسنہ اور ساتھ ہی عصر جدید کی ادبی ترقیات اور اس کی لسانی تبدیلیوں سے باخبر ہوں۔ لہٰذا آپ مدارس عربیہ کا یہ فرض سمجھتے ہیں کہ ادب کی تعلیم کے سلسلے میں ان تمام خامیوں کو دور کیا جائے اور اس کا ایسا نصاب بنایا جائے کہ اس کو پڑھنے کے بعد ایک طالب علم آج کل کی اصطلاح کے مطابق صحیح طور پر ادیب کہلایا جاسکے۔ اسی طرح معانی وبیان اور بدیع کے بارے میں مولانا کا کہنا ہے کہ مدارس میں سب سے زیادہ زور نہیں بدیع پر ہوتا ہے لیکن اصل چیز فصاحت و بلاغت ہے۔ لیکن آپ کا کہنا ہے کہ نہیں بدیع جو متاخرین کی ایجاد ہے اور اس سے بسا اوقات لفظی حسن پیدا کرنے کی کوشش میں اصل معنی کا خون ہوجاتا ہے۔ [۴۲]

صرف ونحو جو علوم آلیہ میں شامل ہے۔ اس کے بارے میں آپ کا کہنا ہے کہ درس نظامی میں صرف ونحو کی جو کتابیں شامل ہیں ان کو تبدیل کرنے کی ضرورت ہے۔

کیونکہ یہ دور انحطاط میں لکھی گئی تھیں اور اس بناء پر ان میں غیر ضروری طباعی و ذہانت اور حد درجہ موشگافی و نکتہ آفرینی کا جو مظاہرہ کیا ہے ان کا تعلق صورت و ظاہر سے زیادہ اور حقیقت و معانی سے کم ہے۔ پھر آپ کا کہنا ہے کہ مدارس میں صرف و نحو کی تعلیم جس طرح دی جاتی ہے اس سے یہ دیکھنا چاہیے کہ اس سے قرآن فہمی کی استعداد کتنی پیدا ہوتی ہے اور اس پر کتنا وقت خرچ ہوتا ہے اور اس کے مقابلے میں جو علم حاصل ہوتا ہے وہ کتنا ہوتا ہے اور اس کی علمی افادیت کس قدر ہوتی ہے۔ آپ یہ سمجھتے ہیں کہ ایک متوسط درجے کی استعداد و ذہانت رکھنے والے طالب علم کے لئے دو سال صرف و نحو کی تکمیل اور ان کے مسائل پر مبصرانہ نگاہ رکھنے کے لئے کافی ہے۔[۴۳]

۳۔ علم منطقیہ: اس میں منطق اور فلسفہ شامل ہے۔ مولانا اکبر آبادی نے فلسفہ کی اہمیت بتاتے ہوئے[۴۴] علمائے کرام کو قدیم فلسفہ کے ساتھ فلسفہ جدید پڑھانے کی طرف بھی توجہ راغب کرائی ہے تاکہ اس کے ذریعے فکر و نظر کی گمراہی کا سدباب کیا جاسکے۔[۴۵]

۴۔ ان کے علاوہ بعض علوم و فنون ایسے ہیں جن کا مذہب سے اگرچہ کوئی تعلق نہیں ہے لیکن مولانا ان علوم کا جاننا ضروری سمجھتے ہیں۔ اس قسم کے علوم میں تاریخ، فلسفہ تاریخ، اقتصادیات، جغرافیہ، علم الالسنہ، علم آثار قدیمہ اور ان سے متعلقہ علوم و فنون داخل ہیں۔[۴۶]

۵۔ نصاب تعلیم کے سلسلے میں آپ اس بات کی بھی ضرورت محسوس کرتے ہیں کہ موجودہ علوم و فنون غیر دینی جو مدارس میں پڑھائے جاتے ہیں ان کی تعلیم کے لئے جو کتابیں رائج ہیں اُن کی جگہ ایسی کتابیں شامل درس کی جائیں جو ان علوم کی تعلیم کے لئے زیادہ مفید اور کارآمد ہوسکتی ہیں۔ علاوہ بریں فنون کی تعلیم سے متعلق مولانا اکبر آبادی قدیم نقطۂ نظر کو بھی تبدیل کرنے کی ضرورت محسوس کرتے ہیں۔[۴۷]

۶۔ آپ انگریزی زبان کی اہمیت سے بھی واقف تھے اور اُس کو نصاب میں شامل کرنے کے خواہاں تھے کیونکہ آپ اس بات سے واقف تھے کہ انگریزی زبان آج بین الاقوامی خط و کتابت اور بین الاقوامی تحریر و تقریر کی زبان ہے اس بناء پر کسی قوم کے لئے اپنے نظام فکر، اپنے مذہب اور اپنے کلچر کی بین الاقوامی اشاعت اُس وقت تک ناممکن ہے جب تک کہ وہ انگریزی زبان کو اشاعت کا ذریعہ نہ بنائے[۴۸]۔ اس سلسلے میں آپ اس امر پر افسوس کا بھی اظہار کرتے ہیں کہ علمائے حق کے انگریزی سے نابلد اور ناواقف ہونے کا آج نتیجہ یہ ہوا ہے کہ یورپ اور امریکہ میں اسلام سے متعلق جو کچھ کام ہورہا ہے وہ ان حضرات کے ذریعے ہورہا ہے جن کو طبقہ علماء میں شمار نہیں کیا جاسکتا اور ان میں اکثریت تو ان لوگوں کی ہے جن کو صحیح عقائد اہل سنت والجماعت کا حامل بھی نہیں کہا جاسکتا۔[۴۹]

۷۔ ہندی زبان جو ملک کی سرکاری زبان بن گئی تھی مولانا اکبر آبادی مدارس عربیہ کو اس زبان کی تعلیم کا بھی خاطر خواہ بندوبست کرنے کے لئے کہتے ہیں تاکہ مدارس کے تعلیم یافتہ ملک کے کاروبار میں حصہ لے سکیں اور شہری زندگی میں درماندہ نہ رہیں۔[۵۰]

۸۔ مولانا سائنس کی اہمیت سے بھی واقف تھے جو عہد حاضر کے علوم میں سب سے زیادہ ترقی یافتہ ہے۔ مولانا اکبر آبادی اسے بڑے کام کی چیز کہتے ہیں۔ کیونکہ اس سے خدا کے وجود اور اُس کی اُلوہیت کا یقین بھی کامل ہوجاتا ہے۔ لیکن اس مضمون کو مدارس عربیہ کے نصاب میں شامل کرنا آپ کے خیال میں مدارس عربیہ کے مقاصد کے ذیل میں نہیں آتا۔[۵۱]

مولانا اکبر آبادی کا مدارس عربیہ کے نصاب اور نظام تعلیم پر تنقیدی مطالعہ اپنی جگہ خود ایک اہم اور جرأت مندانہ قدم ہے کیونکہ آج بھی علماء کی اکثریت مدارس کے نصاب میں کسی تبدیلی کے لئے ذہنی طور پر آمادہ نہیں تاہم ریاستی اور بین الاقوامی دباؤ کے پیش نظر نصاب

میں جدید علم اور زبان کی تدریس کو شامل کیا جارہا ہے مولانا نے درس نظامی کی جس ضرورت کا اظہار کیا ہے وہ وقت کی اہم ضرورت ہے۔

(ب) وحدت تعلیم کا تصور:

مولانا اکبر آبادی نے مدارس عربیہ کے نصاب اور طریقہ تدریس کا جائزہ لینے کے بعد تعلیم سے متعلق دیگر پہلوؤں پر بھی نظر ڈالی ہے۔ ذیل میں اس کا جائزہ لیا جارہا ہے:

جیسا کہ مذکورہ مطالعے سے اندازہ ہوتا ہے کہ مولانا اکبر آبادی مسلمانوں کے نظام تعلیم وتربیت میں نظریہ وحدت تعلیم کے قائل ہیں اور تعلیم کو قدیم وجدید دو حصوں میں تقسیم ہوجانے کو انگریزی حکومت ہی کی "برکت" سمجھتے ہیں ۔ ورنہ آپ کا کہنا ہے کہ مسلمانوں میں دینی اور دنیوی علوم وفنون پر مشتمل ایک ہی نصاب تعلیم رائج رہا ہے۔ آپ نے اس جانب بھی اشارہ کیا ہے کہ علوم وفنون کی اس قدر کثرت اور ان میں جو وسعت پیدا ہوگئی ہے کہ وہ پہلے کبھی نہ تھی اور آج کوئی قوم اُس وقت تک صحیح معنی میں مضبوط اور زندہ قوم نہیں ہوسکتی جب تک کہ اُس میں سب علوم جدید وحاضرہ کے نہ صرف جاننے والے بلکہ ان میں بصیرت ومہارت رکھنے والے افراد موجود نہ ہوں۔ آپ اس حقیقت سے بھی واقف تھے کہ ہر شخص تمام علوم وفنون کا جامع اور ماہر نہیں ہوسکتا اور ایک علم وفن کی تدریس اور اس میں تحقیقی نظر پیدا کرنے کے لئے طبعی طور پر جن اسباب وآلات اور ماحول کی ضرورت ہے وہ دوسرے علم وفن کے لئے ضروری نہیں ہوسکتے۔ اس بناء پر آپ کا کہنا ہے کہ اگر وحدت تعلیم سے مقصد یہ ہے کہ درسگاہیں ایک ہی قسم کی ہوں، نصاب تعلیم سب کا یکساں ہو اور ماحول بھی ایک ہو تو آپ کے خیال میں ایسا ہونا نہ صرف یہ کہ عملاً ناممکن ہے بلکہ قومی اعتبار سے نقصان رساں اور مضر بھی ہوگا۔ لہٰذا آپ کے نزدیک تعلیم کی مدت کو چند حصوں میں منقسم کرکے ابتدائی حصے میں وحدت تعلیم کے نظریہ کو عملی شکل دی جاسکتی ہے۔[۵۲]

(ج) طلباء میں علمی شغف کا فقدان اور اس کی ضرورت:

مولانا اکبر آبادی نے طلباء میں علمی شغف کے فقدان پر بھی تشویش کا اظہار کیا ہے آپ کے نزدیک یہ امر بھی اتنا ہی ضروری ہے کیونکہ تعلیم قدیم ہو یا جدید طلباء میں علمی شغف،

دینی جذبہ، اخلاقی فضائل، اپنی تہذیبی قدروں کا احترام وتعظیم کا صحیح جذبہ پیدا کرنا تعلیمی اداروں کے لئے بے حد ضروری ہے ورنہ آپ سمجھتے ہیں نصاب تعلیم کتنا ہی صالح اور مفید ہو اگر طلباء میں عام دنیاداری کی طرح علم کو ذریعہ معاش بنانے اور اس کے ذریعے دنیوی جاہ ومنصب اور دولت وثروت حاصل کرنے کا جذبہ باقی رہا تو بہترین نصاب تعلیم سے بھی ہماری قومی مشکلات حل نہیں ہوسکتیں۔[۵۳]

دینی تعلیم سے اغماض

ایک مسلمان کی زندگی مذہبی تعلیم کے بغیر کوئی معنی نہیں رکھتی۔ آخرت میں ان کی سرخروئی اور فلاح ونجات اور دنیا میں ان کی قومی زندگی کا تحفظ وبقاسب کا دارومدار اسی ایک چیز پر ہے۔ ہندوستان کی حکومت چونکہ سیکولر تھی اس لئے کسی سرکاری مدرسہ یا اسکول میں دینی تعلیم کا بندوبست نہیں ہوسکتا تھا۔ چونکہ مولانا سعید احمد اکبر آبادی دینی تعلیم کی اہمیت سے واقف تھے اور اس حقیقت سے آگاہ تھے کہ آج ہندوستان کے مسلمانوں کو جو مسائل ومعاملات درپیش ہیں ان میں سب سے اہم خود ان کی اور ان سے زیادہ ان کے بچوں اور بچیوں کی دینی تعلیم وتربیت کا معاملہ ہے[۵۴] ۔اس بناء پر آپ اس بات کی سخت ضرورت محسوس کرتے تھے کہ دینی تعلیم کی ترویج پر فوری توجہ دی جائے، جگہ جگہ کتب کھولے جائیں اور ان میں جبری تعلیم کے ساتھ ساتھ روزانہ ایک دو گھنٹے یا کم از کم ہفتے میں تین دن مسلمان بچوں کو دینی تعلیم دینے کی اجازت حاصل کی جائے اور اس کے علاوہ آپ سب سے زیادہ ضرورت اس بات کی سمجھتے تھے کہ دینی تعلیم کا نصاب ایسا جامع بنایا جائے کہ اسے پڑھ کر ایک بچہ اسلام کے عقائد واعمال سے باخبر اور اسلامی اخلاق واسلامی فکر سے پورے طور پر بہرہ مند ہوسکے[۵۵]۔مولانا سعید احمد اکبر آبادی نے جہاں ایک طرف مسلمان بچوں کو مذہبی تعلیم دینے کے لئے جگہ جگہ کتب کھولنے کی طرف مسلمانوں کی توجہ راغب کرائی ہے وہیں مولانا نے اس کتبی تعلیم کی یہ اہمیت بتائی کہ کتبی تعلیم کی اہمیت کا اندازہ پرانی نسل اور نئی نسل کو دیکھ کر لگایا جاسکتا ہے۔آپ کہتے ہیں پرانی نسل اور آج کی نئی نسل میں وضع داری، مروت، شرم وحیاء، اپنی قومی اور ملی روایات کا پاس واحترام ان

چیزوں کے اعتبار سے جو ایک زمانیاں فرق ہے اس کی بڑی وجہ یہ ہے کہ پرانی نسل کے لوگوں نے خواہ انگریزی اور علوم وفنون جدیدہ کے وہ کتنے ہی ماہر اور تہذیب وتمدن مغرب کے کتنے ہی فیض یافتہ ہوں، اپنی ابتدائی تعلیم مکتبوں میں حاصل کی ہے جہاں انہوں نے مذہب اور اخلاق کا درس لیا ہے اپنے بزرگوں کے اخلاقی کارناموں اور ان کے سوانح حیات کو پڑھا سنا ہے اور ان سب نے مل جل کر ان کے دماغ میں بلند اخلاقی زندگی کی عظمت و بزرگی کا ایسا گہرا نقش پیدا کردیا ہے کہ یورپ اور امریکہ وغیرہ کی اعلیٰ تعلیم اور وہاں کا ماحول بھی اس نقش کو مٹا نہیں سکا ہے۔ ۵۶ لہٰذا آپ کا کہنا ہے کہ یہ مکتبی تعلیم کہنے کو پرائمری تعلیم تھی لیکن اس کے خاص نظام اور ماحول کے اثرات عمر بھر رہتے تھے اور اُن کو کیریکٹر اور کردار کی تعمیر میں بڑا دخل تھا۔ ان مکاتب کے نظام میں جوں جوں اختلال و زوال آتا رہا، ہماری جدید نسلوں کے طور طریق اور اُن کی فکر ونظر کے سانچے بھی بدلتے رہے اور چند برسوں میں ہی حالات کچھ سے کچھ ہوگئے اس بناء پر تعمیر وتشکیل جدید کے اس مرحلے پر آپ ضروری سمجھتے ہیں کہ ان مکاتب کی ازسرنو تنظیم کی جائے لیکن ساتھ ہی آپ یہ بھی کہتے ہیں کہ حکومت کے سیکولر ہونے اور جبری تعلیم کی اسکیم کے نافذ ہونے کے باعث ان مکاتب کا وجود ہی سرے سے خطرے میں پڑ گیا ہے اور ان کا قائم رہنا مشکل ہوگیا ہے۔ لہٰذا مولانا اس اہم مسئلے کی طرف توجہ دلاتے ہیں اور کہتے ہیں اگر صرف اسی قومی تعلیم پر قناعت کرلی گئی اور اس میں جو خلا ہے اس کو پُر کرنے کی کوشش نہیں کی گئی تو بے شبہ مسلمانوں کے حق میں جن کی زندگی مذہبی تعلیم کے بغیر کوئی معنی ہی نہیں رکھتی اس کے نتائج بہت خطرناک اور تباہ کن ہوسکتے ہیں۔ ۵۷

تعلیمی اُمور میں ریاستی مداخلت سے احتراز

مولانا سعید احمد اکبر آبادی سیکولر حکومت میں تعلیم کو حکومت کے اثر سے بالکل آزاد رکھنے کے قائل تھے۔ آپ کا یہ خیال عام تعلیم سے متعلق ہے خواہ وہ مدرسوں میں ہو یا کالج میں۔ لیکن مدارس عربیہ کے لئے تو آپ کی نظر میں اسے حکومت کے اثر سے آزاد رکھنا اور بھی ضروری تھا آپ اس کی وجہ یہ بتاتے ہیں کہ حکومت خواہ مسلمانوں کی ہو یا غیر مسلمانوں کی یا مشترکہ بہرحال جب تک وہ خالص اسلامی طرز کی حکومت نہیں ہوگی اس کی سیاست بے لاگ اور بے

غل وغش نہیں ہوسکتی اور مدارس عربیہ کے لئے ایسی تعلیم درکار ہے جو ہر قسم کے بیرونی اثر اور خارجی عمل دخل سے یکسر آزاد ہو۔ چونکہ مولانا کا کہنا ہے کہ اب ملک میں نیشنل گورنمنٹ قائم ہے اس لفظ "نیشنل" سے ہماری پرانی درسگاہوں کو دھوکہ نہ ہونا چاہیے کیونکہ آپ کا کہنا ہے کہ یہ گورنمنٹ نیشنل ضرور ہے لیکن اسلامک نہیں ہے۔ اور ہماری تعلیم کسی نیشنلزم کی ہرگز پابند نہیں ہوسکتی۔ ۵۸

تعلیمی افراط وتفریط

مولانا سعید احمد اکبر آبادی نے تعلیم کے گرتے ہوئے معیار پر بھی تشویش کا اظہار کیا ہے اور ساتھ ہی مسلمانوں میں تعلیم کے تعلق سے جو دو طبقے پائے جاتے ہیں اور اُن میں عام روش تقلید کی طرف بھی نشاندہی کی ہے۔ آپ چاہتے تھے کہ تعلیم کو تعلیم کے مقصد کے تحت حاصل کیا جائے ۵۹۔ لیکن جس مقصد کے تحت تعلیم حاصل کی جارہی تھی آپ نے اس پر کڑی تنقید کی ہے۔ آپ کا کہنا تھا کہ مسلمانوں میں اصولاً دو قسم کے لوگ پائے جاتے ہیں ایک طبقہ جو چھوٹے دکاندار، کباڑیوں، محنت کشوں اور مزدوروں کا ہے۔ جن کے ہاں تعلیم کی سرے سے کوئی اہمیت نہیں بلکہ وہ ان کے نزدیک کار بحث ہے ۶۰۔ جبکہ دوسرے طبقے کے بارے میں آپ کا کہنا تھا کہ یہ اُن لوگوں کا ہے جو درمیانی درجے کا کہلاتا ہے۔ پہلے کے برعکس اس کا حال یہ ہے کہ اعلیٰ تعلیم کے جنون میں گرفتار ہے اس طبقے میں جب تک کوئی لڑکا یا لڑکی کم از کم ایم اے یا ایم ایس سی نہ ہو اُس وقت تک وہ تعلیم یافتہ کہلانے کا مستحق ہی نہیں۔ مولانا کے نزدیک یہ دونوں طبقے افراط وتفریط کا شکار ہیں ۶۱۔ پہلے طبقے کے متعلق آپ کا کہنا ہے کہ اتنی تعلیم جس سے ایک مسلمان اپنے مذہب کے عقائد، فرائض و واجبات اور حلال و حرام سے واقف ہو۔ ساتھ ہی حساب اور جغرافیہ، اپنی مادری زبان اور ملکی زبان کی تعلیم جس سے وہ ان دونوں زبانوں کے اخبارات اور رسائل پڑھ سکے ہر ایک کے لئے لازمی اور ضروری ہونی چاہیے۔ مولانا کا کہنا ہے اگر اُس میں ذوق ہوگا تو مطالعہ کے ذریعہ وہ اپنی معلومات میں اضافہ کرسکے گا ورنہ اس تعلیم کا اس قدر فائدہ ضرور ہوگا کہ روزمرہ کی زندگی میں کسی کا محتاج نہ ہوگا۔

جبکہ دوسرے طبقے کے بارے میں آپ کا یہ خیال ہے کہ دوسرا طبقہ جو اعلیٰ تعلیم کے جنون میں گرفتار ہے اس کو یہ سوچنا چاہیے کہ دنیا کے جتنے بھی ترقی یافتہ ملک ہیں ان میں کہیں بھی یہ جنون نہیں پایا جاتا[62]۔ کیونکہ مولانا کا کہنا ہے کہ ترقی یافتہ ملکوں میں ہائی اسکول عام طور پر کثیر المقاصد ہوتے ہیں ان میں ہر لڑکا اور ہر لڑکی تعلیم پاتے ہیں ہائی اسکول کے امتحان پاس کرنے کے بعد ہر لڑکے اور لڑکی کا فطری رجحان اور ذہنی استعداد و صلاحیت صاف معلوم ہو جاتی ہے اور اب وہ اپنی آئندہ زندگی کے لئے اسی کے مطابق کوئی لائن اختیار کرتے ہیں۔ اعلیٰ تعلیم وہی نوجوان حاصل کرتے ہیں جن میں علم وفن کا ذوق ہوتا ہے اور جنہوں نے اپنی زندگی کو اس کی خدمت کے لئے وقف کر دینے کا شروع میں ہی عزم کر لیا ہو۔ علاوہ ازیں آپ کا کہنا ہے کہ ترقی یافتہ ملکوں میں ہر علم وفن کی حیثیت یکساں اور برابر سمجھی جاتی ہے۔ وہاں سائنس ٹیکنالوجی، مڈیسن اور انجینئرنگ کو جو وقعت حاصل ہے وہی سوشل سائنسز اور زبان و ادب کو ہے اس بناء پر جو نوجوان آزادی فکر سے کام لے کر اپنے لئے جس راہ کو بھی پسند کرتا ہے اس میں کامیاب رہتا ہے۔[63]

تحصیل علم کے تصورات ورجحانات

مولانا اکبر آبادی نے مسلمانوں میں پائے جانے والے تعلیمی رجحانات وتصورات کی بھی نشاندہی کی ہے اور ان تصورات ورجحانات کو تعلیم کے گرنے کا سبب قرار دیا ہے۔ آپ نے تعلیم کی اس عام روش تقلید جس کے نتیجے میں اُن پر جمود طاری ہے اُس پر رنج وافسوس کا اظہار کیا ہے وہیں آپ کا کہنا ہے کہ ہمارے جتنے بھی کام ہیں تقلیدی اور بھیڑ چال کے حکم میں داخل ہیں۔ آج کل میڈیسن اور انجینئرنگ کی تعلیم کی مانگ ہے اور والدین بھی اپنی اولادوں کو یہی تعلیم دینا چاہتے ہیں اور بیٹی کے والدین بھی رشتہ کرتے وقت انجینئر اور ڈاکٹر کی تلاش کرتے ہیں۔ جن نوجوانوں کو میڈیسن یا انجینئرنگ میں داخلہ نہیں ملتا تب وہ کہیں جاکر دوسرے مضامین کا سوچتے ہیں اور اس چکر میں ان کے کئی سال ضائع ہو جاتے ہیں۔ مولانا کا کہنا ہے جن نوجوانوں میں میڈیسن یا انجینئرنگ کا رجحان ذہنی پایا جائے انہیں لازمی طور پر یہ تعلیم حاصل کرنی چاہیے۔ لیکن اس کے کوئی معنی نہیں کہ جس نوجوان میں تاریخ وفلسفہ یا شعروادب کا فطری

ذوق ہے اس کو بھی مجبور کر کے فزکس، کیمسٹری اور میتھ میٹکس کی تعلیم میں پھنسا دیں[64]۔ لہٰذا مولانا یہ سمجھتے ہیں کہ کسی قوم کی زندگی اور ترقی کا راز صرف اس میں مضمر نہیں کہ اس کا ہر فرد انجینئر یا ڈاکٹر کی تعلیم حاصل کرے بلکہ اس میں ہے کہ ہر فرد بغیر کسی خارجی دباؤ اور جبر کے اپنے رجحان طبعی اور ذہنی استعداد کے مطابق تعلیم حاصل کرے اور اپنے ذوق کے مطابق کوئی بھی پیشہ اختیار کرے۔[65]

مولانا اکبر آبادی نے تعلیم کے گرتے ہوئے معیار پر افسوس کا اظہار کیا ہے اور مسلمانوں کو مشورہ دیا ہے کہ اگر انہیں ایک موثر اور فعال گروہ کی حیثیت سے رہنا اور جینا ہے تو ان حالات کو سامنے رکھ کر انہیں غور کرنا چاہیے کہ ان کا کیا فرض ہے اور انہیں کیا کرنا چاہیے۔ جس میں وہ خود اپنی اولاد کے لئے بہترین تعلیم اور اعلیٰ تربیت کا انتظام اور ساتھ ہی ملک وقوم کی اس معاملے میں مدد کر سکیں[66]۔ اس کے ساتھ ہی مولانا اکبر آبادی نے مسلمانوں کو تعلیم کے تعلق سے دو باتوں کا عزم کرنے کا بھی مشورہ دیا ہے۔

۱۔ ایک یہ کہ وہ تعلیم سے کسی مسلمان لڑکے یا لڑکی کو محض غربت اور افلاس کی وجہ سے محروم نہیں ہونے دیں گے اور صرف یہی نہیں بلکہ بعض پست قسم کا پیشہ کرنے والے مسلمانوں کے بچے بڑے ذہین اور طباع ہوتے ہیں لیکن والدین کو ان کی تعلیم کی طرف توجہ ہی نہیں ہوتی۔ مسلمانوں کا فرض یہ بھی ہوگا کہ وہ اس قسم کے ہونہار، ذہین بچوں کا سراغ لگائیں اور ان کے والدین کو متوجہ کریں کہ وہ تعلیم کا بندوبست کریں۔

۲۔ اور دوسری بات یہ ہے کہ انہیں کم از کم ہر ضلع میں ایک ہائی اسکول اور ایک کالج قائم کرنا ہے جس میں آرٹس، سائنس اور کامرس تینوں کی تعلیم کا اعلیٰ بندوبست ہوگا۔ اس کی بلڈنگ، لائبریری، کھیل کے میدان، لیبارٹریز غرض کہ ہر چیز اعلیٰ سے اعلیٰ ہوگی۔ اس کالج کے اساتذہ کی تنخواہیں بہ نسبت دوسرے کالجوں کے کہیں زیادہ

ہوں گی تاکہ قابل سے قابل اساتذہ فراہم ہوں اور جو یہاں آئیں وہ اطمینان اور دل جمعی سے کام کریں یہ نہ ہو کہ آج یہاں اور کل وہاں، کبھی امریکہ میں کبھی نائجیریا میں۔اس کالج کے ساتھ ہاسٹل بھی لازمی طور پر ہوگا اور کسی طالب علم کو ہاسٹل سے باہر رہنے کی اجازت نہیں ہوگی۔اسی طرح کالج کے کیمپس کے اندر ہی سب اساتذہ کے مکانات ہوں گے اور کوئی استاد کیمپس سے باہر رہنے کا مجاز نہیں ہوگا۔ہفتے میں کم از کم ایک دن اساتذہ اور طلباء ایک ساتھ کھانا کھائیں گے، یہ کالج صرف مسلمانوں کے لئے مخصوص نہیں ہوگا اس میں غیر مسلم طلباء بھی تعلیم حاصل کرسکیں گے لیکن چونکہ مسلمان تعلیم میں پیچھے ہیں اور ان کو دوسرے کالجوں میں داخلہ لینے میں بعض ٹیکنیکل قسم کی دشواریاں بھی ہوتی ہیں اس بناء پر اس کالج میں ۶۰ یا ۷۰ فیصد سیٹیں مسلمان طلباء کے لئے مخصوص ہوں گی۔[۶۷]

جس پر عمل کرتے ہوئے مولانا کے نزدیک مسلمان موجودہ حالات میں تعلیمی نظام میں بہتری لاسکتے ہیں اور تعلیم کے گرتے ہوئے معیار پر قابو پاسکتے ہیں۔

قومی تعلیمی پالیسی

(۱) وردھا تعلیمی اسکیم:

مولانا اکبر آبادی نے ہندوستانی حکومت کی جانب سے مختلف اوقات میں پیش کی جانے والی تعلیمی پالیسیوں کے خصائص کی بھی نشاندہی کی ہے اور اس حوالے سے اپنی تجاویز بھی پیش کی ہیں۔ یہاں اس کا ابتدائی جائزہ لیا جارہا ہے۔آپ نے سب سے پہلے حکومت کی جانب سے ہندوستان کے بچوں اور بچیوں کی ابتدائی تعلیم کی اسکیم کو جو "وردھا تعلیمی اسکیم" کے نام سے مشہور ہے اس کا جائزہ لیا ہے۔آپ اسے وطنی حکومتوں کی ایک مستحسن کوشش کہتے ہیں کہ اس اسکیم میں اخلاقی تربیت کے ساتھ ملک کی اقتصادی حالات کو بہتر بنانے کی عملی تجاویز کو بھی شامل کیا گیا ہے۔ آپ کا کہنا ہے کہ یہ اسکیم دراصل لارڈ میکالے کے اس خواب کا جواب ہے جو انہوں نے ہندوستان میں انگریزی تعلیم کے جاری کرانے پر زور دیتے وقت ۱۸۳۵ء میں دیکھا

تھا[۶۸]۔لیکن جہاں تک اس اسکیم کی افادیت کا تعلق ہے آپ اس میں شبہ نہیں سمجھتے کہ اگر اس پر خلوص اور سچائی کے ساتھ عمل کیا گیا تو اس سے ہندوستان کے اخلاقی، اقتصادی اور معاشرتی حالات بہت کچھ خوشگوار ہوسکتے ہیں۔[۶۹]

لیکن مولانا اکبر آبادی نے اس اعتراف کے ساتھ چند ایسی باتوں کی نشاندہی کی ہے تاکہ اس کی طرف ارکان کمیٹی کو متوجہ کیا جاسکے۔سب سے پہلی چیز آپ کی نظر میں اہم ہے وہ یہ ہے کہ اس اسکیم کے نصاب تعلیم میں مذہبی تعلیم کا جز ضرور شامل ہونا چاہیے۔ مذہبی تعلیم سے آپ کی مراد یہ نہیں کہ بچوں اور بچیوں کو دینیات کی مکمل تعلیم دی جائے بلکہ اس سے آپ کی مراد یہ ہے کہ مذہب کی اخلاقی تعلیم کو تو اسٹیٹ کی نگرانی اور اس کے تصرف سے بالکل آزاد ہونا چاہیے۔تاکہ ہر قوم اپنی اپنی ضرورت اور حوصلہ و ہمت کے مطابق اس کا انتظام خاطر خواہ طریقے پر کرسکے۔ البتہ آپ کا کہنا ہے کہ جہاں تک جبری تعلیم کا تعلق ہے۔ مبادیات مذہب مثلاً مسلمان بچوں کے لئے قرآن مجید کی تعلیم کو ایک اہم جزو کی حیثیت سے اس اسکیم میں شامل ہونا چاہیے۔ کیونکہ آپ سمجھتے ہیں کہ ہندوستان جیسے ملک میں جہاں مذہب ہی پر قومیت کا دارومدار ہے اور یہی سرمایہ زندگی۔ لہٰذا کوئی ایسا نصاب تعلیم تجویز کرنا جس میں مذہب کو شامل نہ کیا گیا ہے، اصلاح جسم کے ساتھ استکمال روح کو فراموش کردینے کے مترادف ہے۔[۷۰]

مولانا کے اس اعتراض پر گاندھی جی اور ڈاکٹر ذاکر حسین نے اپنی متعدد تحریروں اور تقریروں میں مذہبی تعلیم کو اسکول کے اوقات کے علاوہ خارج وقت میں دیے جانے کی بات کی جو ہر قوم اپنی ضرورت کے مطابق اپنا انتظام کرلیگی۔ مولانا اکبر آبادی نے اس تجویز کی بھی مخالفت کی۔ آپ کا کہنا ہے کہ مذہبی تعلیم کی ذمہ داری سے اپنے آپ کو سبکدوش رکھنا اور اس کو قوموں کے سپرد کردینا نتائج کے اعتبار سے مذہبی اسپرٹ کو کم کردینے کا باعث ہوگا۔ کیونکہ مولانا کے نزدیک اس اسکیم کی رو سے جبری تعلیم کی مدت سات برس ہے جو بچہ کی سات برس کی عمر سے شروع ہوکر اس کی چودہ برس کی عمر تک جاری رہے گی۔مولانا کا کہنا ہے ظاہر ہے کہ اگر چودہ برس کی عمر تک بچے کو مذہب کی ابتدائی تعلیم بھی نہیں دی گئی تو کتنے ہی بچے ہونگے جو اپنے

اقتصادی حالات کے باعث اور بالخصوص کوئی ہنر اور کسب معاش کا ایک ذریعہ حاصل کر لینے کے بعد دوسرے مشاغل حیات میں لگ جائیں گے اور یہ جاننے کے باوجود کہ خاص خاص باتوں میں تمام مذاہب کی بنیاد ایک ہی ہے۔ وہ مسلمان یا ہندو ہو کر اپنے اپنے مذہب کی مبادیات سے بھی واقف نہیں ہو سکیں گے۔ رہا سات برس کی مدت میں اوقات مدرسہ کے علاوہ خارج میں مذہب کی تعلیم حاصل کرنے کا خیال تو آپ کے نزدیک اس سے غریب اور متوسط طبقے کے بچے اپنے خصوصی احوال معاشرت ومعیشت کے باعث اس کو عملی صورت میں نہیں لاسکیں گے۔ لہٰذا آپ اسٹیٹ کا فرض سمجھتے ہیں کہ جس طرح وہ اقتصادی مرفہ الحالی کے لئے ایک ایسا عمل لائحہ عمل بنا رہا ہے تو اُسے بچوں کی مذہبی تربیت دینے کا کام بھی اپنے ذمہ لینا چاہیے اور یہ مذہبی تعلیم اوقات مدرسہ میں ہو اور دوسرے مضامین کی طرح کافی نگرانی اور احساس اہمیت کے ساتھ ہو۔ ورنہ آپ کا کہنا ہے کہ اس تغافل وتساہل کا خمیازہ سب سے زیادہ مسلمانوں کو ہی بھگتنا پڑے گا۔[۷۱]

اسی کے ساتھ دوسری اہم چیز جس کی طرف آپ حکومت کی توجہ دلانا چاہتے ہیں وہ "مخلوط تعلیم" کا مسئلہ ہے۔ آپ کا کہنا ہے کہ لڑکیوں کے لئے اس اسکیم میں اگرچہ یہ صراحت کردی گئی ہے کہ ان کے والدین اُنہیں بارہ برس کی عمر میں مدرسے سے اُٹھا سکتے ہیں اور یہ بھی بتایا گیا ہے کہ لڑکیوں کے مدرسے دو قسم کے ہونگے ایک وہ جن میں لڑکیاں لڑکوں کے ساتھ تعلیم پائیں گی اور دوسرے وہ جو صرف لڑکیوں کی تعلیم کے لئے مخصوص ہونگے۔ لیکن مولانا اکبر آبادی اس اسکیم میں اس بات کو ضروری سمجھتے ہیں کہ اس میں اس بات کی صراحت ہونی چاہیے کہ مسلمان لڑکیوں کے لئے تعلیم گاہیں ایسی ہونگی جن میں صرف لڑکیاں ہی تعلیم پاسکیں گی کیونکہ آپ کی نظر میں مسلمان کسی حالت میں بھی مخلوط تعلیم کے متحمل نہیں ہو سکتے۔[۷۲]

(ب) ودیا مندر تعلیمی اسکیم:

اسی سلسلے کی ایک اور اسکیم "صوبہ متوسط" کی ابتدائی تعلیمی اسکیم جس میں اُن مدرسوں کا نام جن میں یہ تعلیم دی جائے گی "ودیا مندر" تجویز کیا گیا ہے۔ مولانا اکبر آبادی اس کو قابل اعتراض بات سمجھتے ہیں کیونکہ آپ کے نزدیک جو اسکیم ہر مذہب وملت کے بچوں کی تعلیم کے

لئے بنائی جائے۔ ضروری ہے کہ اُس کے کسی جزء مشترک میں کوئی ایسی چیز نہ ہو جو ایک قوم کے ساتھ کوئی مذہبی خصوصیت رکھتی ہو اور مسلمانوں کو خوش کرنے کے لئے کہا گیا ہے کہ آئندہ جو کتب خانے قائم کئے جائیں گے اُن کا نام "بیت العلوم" ہوگا۔ اس پر مولانا کا کہنا ہے کہ یہاں کسی قوم کو خوش کرنے نہ کرنے کا سوال نہیں بلکہ ایک اُصول کو مرعی رکھنے کا سوال ہے۔ ان کتب خانوں کا نام "بیت العلوم" نہیں اگر "کعبۃ العلوم" بھی رکھ دیا جائے تو ہمیں اس پر وہی اعتراض ہوگا جو ودیا مندر کا نام سے ہے۔ اس کے ساتھ ہی آپ نے ایک اور مسئلے کی طرف بھی نشاندہی کی ہے وہ مسئلہ ناگپور یونیورسٹی کے نشان خاص کا ہے آپ کا کہنا ہے کہ یہ نشان ناگ کا بنایا جاتا ہے اگر یہ صحیح ہے تو اس کو بھی تبدیل ہونا چاہیے۔[۷۳]

مذکورہ بالا خیالات مولانا اکبر آبادی کی حکومتی تعلیمی پالیسی پر تنقید کی ایسی ٹھوس بنیادیں ہیں جو علمی بھی ہیں اور عقلی بھی۔ مولانا اکبر آبادی نے قومی تعلیمی پالیسی پر تنقید میں تمام تر تعصبات سے بالاتر ہوکر خالصتاً علمی اور عقلی پہلوؤں سے جائزہ لیا ہے جو ایک منصف مزاج ماہر تعلیم کے شایان شان ہے۔

غرض بحیثیت مجموعی مولانا اکبر آبادی نے تعلیمی شعبے سے متعلق جن اُمور ومسائل کا جائزہ لیا ہے اُس کے مطالعے کی روشنی میں دو باتیں یقین سے کہی جاسکتی ہیں۔ اوّل یہ کہ مولانا کی تعلیمی مسائل پر گہری نظر تھی۔ وہ ہر مسئلے کے اسباب وعوامل سے نہ صرف واقف تھے بلکہ اس کا کامل ادراک وشعور بھی رکھتے تھے۔ مولانا نے جن تعلیمی مسائل کی نشاندہی کی ہے اس کی حقیقت سے انکار نہیں کیا جاسکتا ہے۔ مثلاً مدارس دینیہ کے نصاب اور طریقہ تدریس پر مولانا کی تنقیدی نظر وقت اور حالات کے تقاضوں کے مطابق ہے اور یہی نہیں بلکہ مولانا جو خود بھی مدارس عربیہ کے فارغ التحصیل تھے اس پر تنقیدی نظر ڈال کر جرأتمندی اور حقیقت پسندی کا ثبوت پیش کیا ہے۔ گویا ہم کہہ سکتے ہیں کہ مولانا تعلیم کے شعبے میں بے لاگ اصلاحات کے خواہش مند تھے اور اسے عصری تقاضوں سے ہم آہنگ کرنے کی ضرورت محسوس کرتے تھے۔ دوم یہ کہ مولانا کے تعلیمی مباحث میں ایک اہم مقصد مسلمانوں کی تعلیمی ترقی تھا۔ مولانا ہندوستانی مسلمانوں کی تعلیمی پسماندگی پر ہمیشہ فکرمند رہے ہیں۔ وہ مسلمانوں کو تعلیمی میدان میں اپنے برادران وطن

(ہندوؤں) کے ہم پلہ بنانا چاہتے تھے اور مغرب اور یورپ کی ترقی کے ساتھ لے کر چلنا چاہتے تھے۔ تعلیمی شعبے میں مسلمانوں کے ساتھ دلسوزی اور دردمندی کا یہ پہلو بھی نہایت اہم ہے کہ وہ عصری تعلیم کے ساتھ دینی تعلیم کی اہمیت کو ہمیشہ مقدم سمجھتے تھے۔ چنانچہ ایک جدت پسند (modernist) مفکر ہونے کے باوجود مولانا تمام شعبہ ہائے زندگی بالخصوص تعلیمی شعبے میں دینی اقدار و روایات کی اہمیت پر زور دیتے ہیں۔

چنانچہ مولانا کا تعلیم سے گہرے تعلق اور اُن کے تعلیمی افکار کی گہرائی و گیرائی کی روشنی میں ہمیں مولانا ایک منفرد اور ممتاز ماہر تعلیم کے مقام پر نظر آتے ہیں۔

حواشی و حوالہ جات

۱۔ ندوی، سید احتشام احمد، "مولانا سعید احمد اکبرآبادی دیار ہلا یار میں"، مشمولہ: مولانا سعید احمد اکبرآبادی احوال و آثار (مرتبہ) محمد سعود عالم قاسمی، علی گڑھ، شعبۂ سنی دینیات، مسلم یونیورسٹی علی گڑھ، ۲۰۰۵ء، ص ۱۸۲

۲۔ اکبرآبادی، سعید احمد، "نظرات" مشمولہ: برہان، دہلی: ندوۃ المصنفین، جلد سوم شمارہ ۱، جولائی ۱۹۳۹ء، ص ۲

۳۔ ایضاً، جلد بست ہفتم، شمارہ ۲، اگست ۱۹۵۱ء، ص ۸

۴۔ آپ کی نظر میں اس کی اہمیت اس قدر تھی کہ آپ مسلمانوں کو باور کراتے ہیں "انہیں اچھی طرح یہ سمجھ لینا چاہیے کہ وہ خواہ کسی حال میں ہوں اپنے مذہب، کلچر، تہذیب اور خصائص ملّی کی حفاظت اور اس کے لئے سعی وجہد کے فرض سے کبھی معاف نہیں سمجھے جاسکتے کہ ان کی حیات ملّی کا تار و پود انہیں سے تیار ہوتا ہے اور جب یہ بکھر گیا تو پھر حیات ملّی کہاں رہی۔" ایضاً، جلد اول، شمارہ ۱، جولائی ۱۹۳۸ء، ص ۷

۵۔ کیونکہ مولانا کا کہنا ہے کہ ہر زبان کی ترویج و اشاعت کو اہل زبان کی تہذیب، تمدن اور اُن کی معاشرتی خصوصیات کے پھیلانے میں بڑا دخل ہوتا ہے۔ ایضاً، جلد چہارم، شمارہ ۶، جون ۱۹۴۰ء، ص ۴۰۲

۶۔ ایضاً، جلد دوم، شمارہ ۵، مئی ۱۹۳۹ء، ص ۳۴۷-۳۴۸

۷۔ ایضاً، جلد ۳۴، شمارہ ۶، جون ۱۹۵۵ء، ص ۳۶۲

۸۔ ایضاً، جلد بست و دوم، شمارہ ۳، مارچ ۱۹۴۹ء، ص ۱۳۱

۹۔ ایضاً

۱۰۔ ایضاً، جلد بست و دوم، شمارہ ۵، مئی ۱۹۴۹ء، ص ۲۵۹

۱۱۔ ایضاً، جلد بست و دوم، شمارہ ۳، مارچ ۱۹۴۹ء، ص ۱۳۲

۱۲۔ ایضاً، جلد چہارم شمارہ ۶، جون ۱۹۴۰ء، ص ۴۰۲

۱۳۔ ایضاً

۱۴۔ ایضاً، ص ۴۰۴-۴۰۵

۱۵۔ ایضاً، ص ۴۰۷

۱۶۔ ایضاً، جلد دوم، شمارہ ۶، جون ۱۹۳۹ء، ص ۴۰۶

۱۷۔ ایضاً، ص ۴۰۷-۴۰۸

۱۸۔ ایضاً، جلد نہم، شمارہ ۴، اکتوبر ۱۹۴۲ء، ص ۲۲۲

۱۹۔ ایضاً، ص ۲۲۲-۲۲۳

۲۰۔ ایضاً، جلد ۸۴، شمارہ ۶، جون ۱۹۸۰ء، ص ۴

۲۱۔ ایضاً، اکتوبر ۱۹۴۲ء، ص ۲۲۳

۲۲۔ ایضاً، جلد ۳۴، شمارہ ۶، جون ۱۹۵۵ء، ص ۳۲۳

۲۳۔ ایضاً

۲۴۔ ایضاً

۲۵۔ ایضاً، ص ۳۲۳-۳۲۴

۲۶۔ ایضاً، ص ۳۲۴

۲۷۔ ایضاً، جلد ۳۴، شمارہ ۳، مارچ ۱۹۵۵ء، ص ۱۳۲

۲۸۔ ایضاً، "مدارس عربیہ کے لئے ایک لائحہ عمل" مشمولہ: برہان، دہلی: ندوۃ المصنفین، جلد ۳۲، شمارہ ۶، جون ۱۹۵۴ء، ص ۳۲۳-۳۲۴

۲۹۔ ایضاً، ص ۳۲۵

۳۰۔ اس سلسلے میں مولانا کا کہنا ہے کہ ہندوستان میں برطانوی راج کے قدم جم جانے کے بعد بعض دوراندیش اور دردمند علماء نے محسوس کیا کہ اس انقلاب کا سب سے بڑا اثر مسلمانوں کے دین اور مذہب پر پڑ سکتا ہے۔ اب نئی حکومت کے ماتحت نئی زبان اور نئے علوم و فنون کی ترویج و اشاعت کا سروسامان کیا جائے گا اس بنا پر اگر اس وقت مسلمانوں کے دین کو محفوظ رکھنے کی کوشش نہ کی گئی تو اس کا نتیجہ ارتداد کی شکل میں ظاہر ہو سکتا ہے اس خطرہ کے انسداد کے لئے ان علماء نے مدارس کا اجراء کیا اور پہلے دیوبند اور مرادآباد میں اور اس کے بعد دوسرے شہروں اور قصبوں میں مدارس کا ایک طویل سلسلہ قائم کر دیا۔ لیکن ان مدارس کے قیام سے اصل مقصد چونکہ دین کا تحفظ تھا اور انقلاب حکومت نے جو خطرات پیدا کر دیئے تھے ان کے پیش نظر علماء کے نزدیک اس سے زیادہ ضروری کوئی دوسری چیز نہیں ہو سکتی تھی۔ ایضاً، ص ۳۲۶

۳۱؎ ایضاً، ص ۳۲۷

۳۲؎ ایضاً، جلد ۳۳، شمارہ ۱، جولائی ۱۹۵۴ء، ص ۴

۳۳؎ ایضاً، "نظرات"، جلد ۳۸، شمارہ ۱، جنوری ۱۹۵۷ء، ص ۳-۴

۳۴؎ آپ واضح کرتے ہیں پہلے زمانے میں جیسا کہ آج کل یونیورسٹیوں کی اعلیٰ کلاسوں میں ہوتا ہے طریقہ تعلیم املا تھا۔ استاد کسی مسئلے پر فنی حیثیت سے کلام کرتا تھا اور تلامذہ اس کو قلمبند کرتے جاتے تھے اس طرح تعلیم کسی خاص ایک کتاب کی نہیں بلکہ فن کی ہوتی تھی اور طلباء کو استاد کے لیکچروں کے ذریعے فنی بصیرت پیدا ہو جاتی تھی لیکن آج کل ہوتا یہ ہے کہ استاد کی تمام تر توجہ کتاب کی عبارتی پیچیدگیوں اور مصنف کے مافی الضمیر کی تشریح و تفصیل پر مرکوز رہتی ہے نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ طالب علم نحو میں کافیہ اور شرح جامی پڑھتا ہے مگر اسے نحو نہیں آتی۔ منطق میں سلم اور ملا حسن پڑھتا ہے مگر منطق سے کورا ہی رہتا ہے اصول فقہ میں اصول الشاشی اور نور الانوار کا درس لیتا ہے لیکن جیسا کہ اصول فقہ کے ایک طالب علم سے توقع کرنی چاہیے۔ وہ اس قابل نہیں ہوتا کہ وقت کا کوئی اہم مسئلہ سامنے آجائے تو وہ اصول احکام کی روشنی میں کوئی حکم مستنبط کر سکے۔ ایضاً، جلد بیز دہم، شمارہ ۳، مارچ ۱۹۴۷ء، ص ۱۳۲

۳۵؎ ایضاً، ص ۱۳۳

۳۶؎ ایضاً، جلد ۳۲، شمارہ ۵، مئی ۱۹۵۴ء، ص ۲۵۸

۳۷؎ علوم دینیہ میں تفسیر، حدیث، اصول حدیث، فقہ اور اصول فقہ شامل ہیں۔ ایضاً، جلد بیز دہم، شمارہ ۳، مارچ ۱۹۴۷ء، ص ۱۳۱

۳۸؎ علوم آلیہ یہ گویا ایسے علوم ہیں جن کی بذات خود کوئی اہمیت نہیں ہے لیکن چونکہ ان کے پڑھنے پڑھانے اور درس و مطالعہ سے قرآن و حدیث کے سمجھنے میں مدد ملتی ہے۔ ایضاً، "مدارس عربیہ کے لئے ایک لمحہ فکر"، جلد ۳۲، شمارہ ۶، جون ۱۹۵۴ء، ص ۳۲۷

۳۹؎ علوم عقلیہ ان سے مراد وہ علوم ہیں جو نہ خود دین ہیں اور نہ جن سے علوم دینیہ کے سمجھنے میں مدد ملتی ہے۔ ان کی حیثیت صرف یہ ہے کہ یہ علوم عصریہ تھے علمائے اسلام نے شروع شروع میں ان علوم کے پڑھنے پڑھانے کی مخالفت کی لیکن جب دیکھا کہ یہ ارباب باطل کا ہتھیار بن گئے تو انہوں نے خود ان علوم کو پڑھا اور ان پر تنقید کر کے مسائل دین کے مقابلے میں ان کی اثر آفرینی ختم کر دی۔ ایضاً، "نظرات"، جلد بیز دہم، شمارہ ۳، مارچ ۱۹۴۷ء، ص ۱۳۱

۴۰؎ ان علوم و فنون کی اصلاح سے متعلق مختلف تجاویز مولانا اکبر آبادی نے اپنے مضمون "مدارس عربیہ کے لئے ایک لمحہ فکر" میں تفصیل سے بیان کی ہیں۔ جس کا احاطہ کرنا یہاں ممکن نہیں صرف ضروری نکات بیان کر دی گئیں ہیں۔ تفصیل کے لئے مولانا کے اسی مضمون کا شمارہ جولائی، اگست، ستمبر ۱۹۵۴ء، اور جنوری ۱۹۵۵ء ملاحظہ ہو۔

۴۱؎ مولانا کہتے ہیں ہمیں قرآن و سنت کا مطالعہ کرتے وقت یہ حقیقت فراموش نہ کرنی چاہیے کہ دین کا اصل ماخذ یہی دو چیزیں ہیں فقہ اگرچہ اپنی اصل کے اعتبار سے ساتھ ساتھ آیا لیکن باقاعدہ مذاہب اربعہ کی شکل میں اس کی ترتیب و تدوین بعد میں ہوئی۔ ان کے علاوہ فقہ کے اور بھی بہت سے مذاہب و مسالک جو اب دنیا سے ناپید ہو چکے ہیں یا جن کے ماننے والے خال خال نیولس، الجزائر، مغرب اقصیٰ یا نجد و شام اور یمن و عمان کے علاقوں میں پائے جاتے ہیں ان سب کا استخراج و استنباط بھی انہی سرچشموں سے ہوا تھا اور اسی بنا پر ان دینوں کی حیثیت جو ماخذ اور منبوع ہونے کی ہے وہ قائم رکھنی چاہیے۔ ایضاً، "مدارس عربیہ کے لئے ایک لمحہ فکر"، جلد ۳۳، شمارہ ۱، جولائی ۱۹۵۴ء، ص ۳-۴

۴۲؎ ایضاً، "نظرات"، جلد بیز دہم شمارہ ۳، مارچ ۱۹۴۷ء، ص ۱۳۳

۴۳؎ ایضاً، "مدارس عربیہ کے لئے ایک لمحہ فکر"، جلد ۳۳، شمارہ ۱، جولائی ۱۹۵۴ء، ص ۶-۷

۴۴؎ مولانا کہتے ہیں بعض علوم و فنون کا مذہب سے براہ راست تو کوئی تعلق نہیں ہوتا لیکن بالواسطہ ان کے اثرات بہت گہرے اور دور رس ہوتے ہیں اور انسان کا مذہبی شعور بھی ان اثرات کی زد سے محفوظ نہیں رہتا۔ مثلاً فلسفہ اور اس کی مختلف شاخیں، ان علوم کا حاصل کرنا علمی افادیت سے قطع نظر، دین کی تبلیغ و اشاعت اور اس کی حفاظت و صیانت کے پیش نظر بھی ضروری ہو گا تا کہ اسلامی عقائد و افکار پر جس طرح اور جہت سے حملوں کا اندیشہ ہو ان کے خلاف مورچہ بندی کر لی جائے اور مسلمانوں اور غیر مسلموں دونوں کو ضلالت فکر و عمل سے بچایا جا سکے۔ ایضاً، جلد ۳۴، شمارہ ۱، جنوری ۱۹۵۵ء، ص ۴

۴۵؎ مولانا کہتے ہیں موجودہ فلسفہ کو سائنس کے ساتھ ربط پیدا ہی ہے اور یورپ کے بہت سے فلاسفر سائنس دان بھی ہیں اس لئے یہ فلسفہ حقائق کا بالکل صحیح ترجمان نہیں تو حقائق سے بہت زیادہ قریب آ گیا ہے اور اس بنا پر ذہن کو اجالا اور فکر و خیال کو پختگی بخشتا ہے پھر اس حقیقت سے بھی انکار نہیں ہو سکتا کہ آج دنیا کا عظیم الشان فکری و عملی انقلاب جہاں صنعت و حرفت اور سائنس کا مرہون احسان ہے۔ اس میں بہت بڑا دخل فلسفہ جدید کو بھی ہے اور خاص طور پر اس نے اخلاقیات کی دنیا میں تو وہ بحران عظیم پیدا کیا ہے کہ حسن و قبح کا معیار اور اشیا کے اقدار کو بدل کر رکھ دیا ہے۔ ایضاً، ص ۴-۵

۴۶؎ مولانا کہتے ہیں قرآن مجید کے بیان کردہ حقائق مثلاً عروج و زوال اقوام کے اسباب، نفسیات خیر و شر، انسانی فکر و شعور کا تدریجی ارتقاء، جزائے اعمال، اصول حکومت و سلطنت، اصول معیشت اور ان کے علاوہ دوسری اسلامی تعلیمات، ان کے سمجھنے میں یا ان سے متعلق یقین و اعتقاد کی پختگی میں مدد ملتی ہے تو ظاہر ہے کہ علمی اور دینی دونوں قسم کے نقطۂ نظر سے ان کا حاصل کرنا بھی بحیثیت مجموعی ضروری ہو گا۔ ایضاً، ص ۴

۴۷؎ ایضاً، "نظرات"، جلد بیز دہم، شمارہ ۳، مارچ ۱۹۴۷ء، ص ۱۳۳-۱۳۴

۴۸؎ ایضاً، "مدارس عربیہ کے لئے ایک لمحہ فکر"، جلد ۳۴، شمارہ ۱، جنوری ۱۹۵۵ء، ص ۶

۴۹۔ ایضاً

۵۰۔ ایضاً

۵۱۔ کیونکہ مولانا کا کہنا ہے کہ مدارس عربیہ کا مقصد ایسے علماء پیدا کرنا ہے جو علوم دینیہ اور عربی کے ساتھ وقت کی علمی اسپرٹ اور فکری رجحانات سے بھی باخبر ہوں نہ کہ انجینئر، ماہر فن صنعت وحرفت یا بزنس مین ہوں۔ ایضاً، ص ۹

۵۲۔ مولانا کہتے ہیں کہ مثلاً میٹرک تک کا نصاب ایسا بنایا جائے اور وہ سب کے لئے لازمی ہو کہ اسے پڑھنے کے بعد ایک مسلمان طالب علم میں ایک طرف دینی علوم سے مناسبت پیدا ہو جائے اور دوسری طرف ضروری علوم عصریہ سے وہ ناآشنا نہ رہے۔ یہ نصاب پرائمری تعلیم کے ختم ہونے کے بعد زیادہ سے زیادہ پانچ سال کا ہونا چاہیے۔ اس کے بعد ہر طالب علم کو اس کا موقع دیا جانا چاہیے کہ وہ اپنے فطری ذوق اور ذاتی صلاحیت و استعداد کے مطابق جس شعبے میں چاہے کمال و امتیاز پیدا کرے۔ اس مرحلے پر مدارس عربیہ میں انگریزی علوم وفنون کی یونیورسٹیوں کی طرح دینی اور عربی علوم کو مختلف شعبوں میں تقسیم کرکے ہر شعبے کے لئے الگ الگ اعلا ثانوی تعلیم اور پھر اس کے بعد درجہ تکمیل کا بندوبست کرنا چاہیے۔ درجہ تکمیل میں تدریس کا کام کم اور ریسرچ کا کام زیادہ ہو۔ ایضاً، "نظرات" جلد سیزدہم، شمارہ ۴، اپریل ۱۹۴۷ء، ص ۱۹۴۔۱۹۵

۵۳۔ ایضاً، ص ۱۹۵

۵۴۔ ایضاً، جلد ۳۲، شمارہ ۴، اپریل ۱۹۵۴ء، ص ۱۹۵

۵۵۔ مولانا مزید وضاحت کرتے ہیں کہ اس بچے میں صحیح معنی میں خدا ترسی ہو، نیک کاموں کی طرف اس کا فطری میلان ہو، اپنوں اور دوسروں کے ساتھ معاملہ کرتے وقت اس میں اسلامی اخلاق و کردار کی پوری جھلک ہو، اسلامی شعائر و احکام اور بزرگان اسلام کی حقیقی عظمت و احترام اس کے دل میں موجود ہو، عزت نفس کے ساتھ ساتھ بنی نوع انسان کی خدمت کا جذبہ اس میں بدرجہ اتم موجود ہو۔ ایضاً، ص ۱۹۶

۵۶۔ ایضاً، جلد ۳۴، شمارہ ۲، فروری ۱۹۵۵ء، ص ۶۶

۵۷۔ ایضاً، ص ۶۶۔۶۷

۵۸۔ ایضاً، جلد سیزدہم، شمارہ ۴، اپریل ۱۹۴۷ء، ص ۱۹۵۔۱۹۶

۵۹۔ مولانا نے صحیح تعلیم کی تعریف اور اس کا مقصد یہ بیان کیا ہے: To know something About Everything And Everything About Something. یعنی "تھوڑا بہت ہر ایک چیز کو جاننا اور کسی چیز کو مکمل طور پر جاننا"۔ آپ کا کہنا ہے کہ یہ مقولہ غالباً یونان کے کسی حکیم کا تھا۔ بہر حال اس میں شبہ نہیں کہ تعلیم کی تعریف اس سے بہتر نہیں ہو سکتی اور مسلمانوں کے ہاں جو نظام تعلیم ان کے دور عروج و ترقی میں رائج رہا ہے وہ تعلیم کی اس تعریف کا صحیح مصداق تھا چنانچہ ان کے نصاب میں جہاں ایک طرف علوم دینیہ اور نقلی علوم شامل ہوتے تھے جن سے خدا اور انسان کا علم حاصل ہوتا تھا تو ساتھ ہی سائنس کے علوم بھی ہوتے تھے جن سے

کائنات سے واقفیت ہوتی تھی۔ ایضاً، "اقبال، المعظم"، مشمولہ برہان، دہلی: ندوۃ المصنفین، جلد ۱۵، شمارہ ۶، دسمبر ۱۹۴۵ء، ص ۳۶۸

۶۰۔ آپ کا کہنا ہے کہ یہ لوگ چونکہ مسلمان ہیں اس لئے اپنے بچوں کو محلے کے مکتب میں بھیج کر قرآن مجید، کچھ دینیات اور کچھ اردو وغیرہ کی تعلیم تو دلا دیتے ہیں لیکن اس کے بعد جو پیشہ اپنا ہے وہی بچوں کے لئے پسند کرتے ہیں اور تعلیم ختم ہو جاتی ہے۔ ایضاً، ص ۳۶۹

۶۱۔ ایضاً

۶۲۔ ایضاً

۶۳۔ ایضاً، ص ۳۶۹۔۳۷۰

۶۴۔ ایضاً، ص ۳۷۰

۶۵۔ ایضاً

۶۶۔ ایضاً، جلد ۶۶، شمارہ ۱، جنوری ۱۹۷۱ء، ص ۱۰

۶۷۔ ایضاً، جلد ۶۶، شمارہ ۲، فروری ۱۹۷۱ء، ص ۷۸۔۷۹

۶۸۔ ایضاً، جلد اول، شمارہ ۱، اگست ۱۹۳۸ء، ص ۷۴

۶۹۔ ایضاً

۷۰۔ ایضاً، ص ۷۵

۷۱۔ ایضاً، ص ۷۵۔۷۶

۷۲۔ ایضاً، ص ۷۷

۷۳۔ ایضاً

التفسیر، مجلس تفسیر، کراچی جلد۲، شمارہ ۱۸، اپریل تا ستمبر ۲۰۱۲ء

علامہ سید احمد سعید کاظمی۔ ایک عہد ساز شخصیت

محمد طاہر صدیقی

Allama Sayyed Ahmad Saeed Kazimi is the great illustrious brave man in 20th century who sacrificed for the religion and the nation before the settlement of Pakistan and afterwards. He was one of vanguard leaders in all movements as the movement of settlement of Pakistan, the movement of the supreme efforts (Jihad for Kashmir, the movement to protect the finality of prophethood (of Muhammad), and the movement for establishment of Muhammads Law in Pakistan. He was a great Islamic scholar and unique orator, possessed leading qualities.

He also served as a Shaikh-ul-Hadith for eleven years in Jamiah Islamiah Bahawalpur from 1962 to 1974. He was the either the founder of most Muslim organizations or was the part of them, such as

Jama'at e Ahle sunnat, Jamiat Ulama-e-Pakistan, and Dawat-e-Islami, Anjuman Tulaba-e-Islam. He also wrote several books reveal important Islamic and national issues.

تقسیم ہند ۱۹۴۷ء سے قبل اور بعد جن قابل فخر شخصیات نے مسلمانان برصغیر پاک و ہند بالخصوص اہل پاکستان کے لئے دینی، قومی اور ملی خدمات پیش کیں، علامہ سید احمد سعید کاظمی امروہی علیہ الرحمہ کا شمار انہیں عظیم لوگوں میں ہوتا ہے۔ آپ نہ صرف اپنے وقت کے نامور محدث، بے مثل فقیہ، عظیم محقق اور نباض عصر تھے بلکہ ایک ولی کامل، عظیم پیشوا اور بے باک قائد بھی تھے جو علم حدیث و تفسیر، ادب و فقہ، منطق و فلسفہ، تاریخ و تحقیق، کلام و معانی میں ید طولیٰ رکھنے کا ساتھ ساتھ ایک بے مثل خطیب اور ادیب بھی تھا۔ کسی موضوع پر لب کشائی فرماتے تو علم کا ایک بحر بے کنار موجزن ہو جاتا، کسی عنوان پر قلم اٹھاتے تو دلائل قاہرہ کے انبار لگا دیتے کہ شکوک و شبہات کی گھاٹیوں میں بھٹکنے والے منزل حقیقت تک رسائی پا لیتے۔ آپ عشق رسول ﷺ کی دولت لازوال سے سرشار تھے، آپ کے فیض یافتگان میں تلامذہ کے علاوہ بے شمار مریدین بھی شامل ہیں۔ اپنے بیگانے سبھی آپ کے دینی، علمی، ملی کارناموں اور قائدانہ صلاحیتوں کے معترف بھی ہیں۔ اسی خداداد علمی قابلیت و استعداد کی بنا پر ممتاز مفسر قرآن سید محمد کچھوچھوی علیہ الرحمہ نے ڈیڑھ سو جید علماء و دانشور اور عوام کے جم غفیر میں آپ کو "غزالیٔ زماں رازیٔ دوراں" کا خطاب دیا جو آپ کی ایسی پہچان بنا کہ آپ کے بعد کسی اور کے لیے استعمال نہ ہوا۔[1]

حالات زندگی:

آپ ۴ ربیع الثانی ۱۳۳۱ھ بمطابق ۱۳ مارچ ۱۹۱۳ء کو امروہہ ضلع مراد آباد، بھارت میں سید مختار احمد کاظمی کے گھر پیدا ہوئے، آپ کا سلسلہ نسب ۳۶ واسطوں سے حضرت امام موسیٰ کاظم رحمۃ اللہ علیہ سے جا ملتا ہے۔ آپ ابھی بچپن ہی میں تھے کہ والد ماجد کا سایہ سر سے اٹھ گیا یوں آپ کی پرورش و تربیت آپ کے بڑے بھائی علامہ سید خلیل احمد کاظمی محدث امروہی کے زیر نگرانی ہوئی جو

جید عالم دین، عظیم محدث اور صاحب نظر درویش تھے۔ بعد ازاں آپ نے ابتداء سے انتہاء تک تمام تعلیم اپنے برادر محترم ہی سے حاصل کی، ۱۹۲۵ء میں مدرسہ محمدیہ امروہہ سے سند فراغت حاصل کی، دستار فضیلت کے موقع پر حضرت شاہ علی حسین اشرفی تشریف لائے اور اپنے مبارک ہاتھوں سے آپ کے سر پر دستار فضیلت باندھی، اس موقع پر علامہ سید محمد نعیم الدین مرادآبادی اور دیگر علماء کرام و مشائخ عظام بھی موجود تھے۔ ع

علم شریعت کے ساتھ ساتھ علم طریقت و حقیقت کی منازل طے کرنے کے لیے آپ نے اپنے برادر اکبر استاد محترم سید خلیل احمد کاظمی کے ہاتھ پر بیعت کی جنہوں نے روحانی منازل بھی طے کروائیں اور اپنی خلافت سے بھی نوازا۔ فارغ التحصیل ہونے کے بعد آپ اپنے احباب سے ملاقات کے لیے لاہور تشریف لے گئے جہاں آپ حضرت سید دیدار علی شاہ صاحب کی زیارت سے مستفیض ہوئے اور حضرت مولانا سید ابوالبرکات اور مولانا سید ابو الحسنات قادری سے ملاقات ہوئی، کچھ عرصہ جامعہ نعمانیہ میں تدریس کے فرائض سرانجام دیئے۔ لاہور سے واپس مرادآباد تشریف لے گئے، کچھ عرصہ تک امروہہ کے مدرسہ محمدیہ حنفیہ میں محمد خلیل اللہ سے مجلس ہوتی رہی اور متعدد علمی مباحثے ہوتے رہے، اسی دوران مشہور مناظر مولوی مرتضیٰ در بھنگوی سے بھی کئی بار مناظرے ہوئے جن میں آپ اللہ کے فضل وکرم سے کامیاب و کامران رہے۔ لاہور کے زمانہ قیام میں حکیم محمد جان عالم سے آپ کے دوستانہ تعلقات پیدا ہوگئے، انہی کے اصرار پر آپ دو سال کے لئے اوکاڑہ تشریف لے گئے، اس زمانہ میں اوکاڑہ میں گستاخان رسول کی بڑی شورش تھی، ہر طرف تنقیص رسالت کی مہم جاری تھی، آپ نے وہاں جاکر مسلک اہل سنت کی تبلیغ اور درس وتدریس کے سلسلہ کو جاری کیا جس سے بہت جلد فضا بہتر ہوگئی۔ ع

مدینۃ الاولیاء ملتان میں آمد:

ایک بار آپ حضرت غریب نواز رحمہ اللہ تعالیٰ کے عرس کی تقریبات کے سلسلہ میں ملتان تشریف لائے اور ایک سحر انگیز خطاب فرمایا جس سے حاضرین کے دل نور معرفت سے جگمگانے لگے، خطاب سے متاثر ہوکر ملتان کے اکابر علماء و مشائخ نے سکونت اختیار کرنے کی دعوت دی جسے آپ نے قبول کرتے ہوئے ملتان کو اپنا ہمیشہ کے لیے مسکن بنالیا، اپنے مکان ہی

میں درس وتدریس کا سلسلہ شروع کردیا اور ساتھ ہی مسجد نخ شیریں میں درس قرآن اور مسجد چپ شاہ میں درس حدیث کا آغاز کردیا، ۱۹۳۵ء میں آپ مستقل طور پر ملتان میں سکونت پذیر ہوگئے۔ ع

خدمات جلیلہ :-

جامعہ انوار العلوم کا قیام:

۱۹۴۳ء میں مخالفین اہلسنت نے آپ کی دینی کوششوں سے بوکھلا کر ایک جلسہ میں آپ پر کلہاڑیوں سے قاتلانہ حملہ کردیا، اس شدید واقعہ کے بعد آپ کو ملتان لایا گیا تو آپ نے تاریخ جملے ارشاد فرمائے: ''موت وحیات تو رب العالمین کے ہاتھ میں ہے مجھے اس حملے کا دکھ یا موت کا خوف نہیں بصرف اس کا ملال ہے کہ کوئی مدرسہ قائم نہ کرسکا جو میرے لیے صدقہ جاریہ ہوتا اور دین کا قلعہ بنتا''۔ دل کی گہرائیوں سے نکلے ہوئے الفاظ نے وہ اثر ڈالا کہ ارادت مندوں نے مالی اعانت کی اور آپ کی اہلیہ نے اپنا زیور پیش کیا جسے فروخت کرکے آپ نے جامعہ اسلامیہ عربیہ انوار العلوم کے نام سے عظیم درسگاہ قائم فرمائی جس کا سنگ بنیاد حضرت موسیٰ پاک شہید کے سجادہ نشین حضرت سید صدرالدین شاہ علیہ الرحمہ نے ۱۹۴۴ء میں رکھا۔ آپ نے خود ہی اس میں درس نظامی کی تعلیم دینی شروع کردی۔

تحریک پاکستان:

سب سے پہلے اعلیٰ حضرت امام احمد رضا خان بریلوی نے دوقومی نظریہ کی حمایت کی، ان کا نقطۂ نظر یہ تھا کہ انگریز اور ہندو چونکہ دونوں مسلمانوں کے دشمن ہیں لہٰذا ایک سے ترک موالات کرنا اور دوسرے کو گلے لگانا درست نہیں، دونوں سے ترک موالات ہونا چاہیے اور اسی نظریے کو آگے بڑھنا چاہیے، ۱۹۰۶ء میں مسلم لیگ کی بنیاد ڈالی گئی، اعلیٰ حضرت امام احمد رضا خان بریلوی علیہ الرحمہ کے خلیفۂ مجاز مفتی سید نعیم الدین مرادآبادی نے ۱۹۲۵ء میں آل انڈیا سنی کانفرنس کی بنیاد رکھی اور اس کی تنظیم پورے برصغیر میں فرمائی، زیادہ تر قائدین اہلسنت اور سنی علماء ومشائخ اس سے وابستہ تھے اور انہوں نے قیام پاکستان تک اس پلیٹ فارم سے مسلم لیگ کی حمایت میں شب روز کام کیا جبکہ بعض قائدین اہلسنت اور سنی علماء مشائخ براہ راست بھی

مسلم لیگ میں شامل تھے جیسے شیخ الاسلام خواجہ قمر الدین سیالوی، خلیفہ اعلیٰ حضرت مفتی برہان الحق جبلپوری مولانا عبدالستار نیازی مولانا ظہور الحسن درس ،مخدوم سید چراغ علی شاہ، پیر عبد اللطیف زکوڑی ،سید احمد سعید شاہ کاظمی وغیرہم۔[6]

سید احمد سعید کاظمی علیہ الرحمہ کا شمار تحریک پاکستان کے نامور مجاہدین میں ہوتا ہے ،صدر الافاضل مولانا نعیم الدین مراد آبادی ،سید محمد محدث کچھوچھوی ،امیر ملت پیر جماعت علی شاہ محدث علی پوری ، پیر آف مانکی شریف، شاہ عبد العلیم صدیقی والد ماجد مولانا شاہ احمد نورانی ، مولانا عبد الحامد بدایونی، غازی ملت علامہ ابو الحسنات سید محمد احمد قادری، شیخ القرآن علامہ عبد الغفور ہزاروی اور دیگر علماء و مشائخ کے ساتھ آپ نے طول برصغیر کے طول وعرض کے دورے کیے اور بیشمار اجتماعات سے خطابات کرتے ہوئے پاکستان کو اسلامیان برصغیر کے لیے ناگزیر قرار دیا ،جب حج بیت اللہ کے لیے تشریف لے گئے تو وہاں بھی علماء کے عظیم اجتماع سے خطاب کرتے ہوئے قیام پاکستان کی اہمیت پر روشنی ڈالی اور نظریہ پاکستان کی اسلامی اہمیت کو روشناس کرانے کے لیے اخبارات میں متعدد مضامین رقم فرمائے ۱۹۳۰ء اور ۱۹۴۰ء کی دہائی مسلمانان برصغیر کے لیے اہم تھی ،اسی عشرہ میں آپ نے لاہور ،ملتان اور دیگر ملحقہ علاقوں میں تحریک پاکستان کے لیے زبردست کام کیا آپ کی سحر انگیز شخصیت ،پُرفریب اور ولولہ انگیز بیانات نے چھ سات برسوں میں وہ کام کر دکھایا کہ کانگریس رہنماؤں اور ہم نواؤں کی نصف صدی کی جدوجہد دھری کی دھری رہ گئی۔ [7]

مسلم لیگ میں شمولیت:

آپ نے اسلامیہ ہال لاہور میں منعقدہ جلسوں میں نہ صرف مسلم لیگ کی وکالت کرتے ہوئے مخالفین پاکستان کا مقابلہ کیا بلکہ خود بھی ۱۹۳۵ء میں مسلم لیگ میں شمولیت اختیار کی اور دوقومی نظریے کا تحفظ کرتے ہوئے ''پاکستان کی ضرورت کیوں'' کے عنوان سے سندھ اور پنجاب کے مختلف شہروں میں تقاریر کیں۔ ملتان اور اس کے گردونواح میں تحریک پاکستان کی مخالف تحریک مجلس احرار کا خاصا زور تھا اس جماعت کے رہنما سید عطاء اللہ شاہ بخاری کی خطابت نے یہاں کے نوجوانوں کو مسلم لیگ کے خلاف منظم کیا اور اس کا اتنا زور بندھا کہ لاہور سے

شورش کاشمیری کو ملتان کے جلسوں میں خصوصی مقرر کے طور پر بار بار بلایا جانے لگا ،ان حالات میں مسلم لیگ کے ترجمان کی حیثیت سے آپ کی ایمان افروز تقاریر نے مخالفین مسلم لیگ کی کوششوں پر پانی پھیر دیا بالآخر آپ اور دوسرے علماء و مشائخ کی قربانیوں کا ثمر قیام پاکستان کی صورت میں صبح آزادی کی تنویر بن گیا۔ [8]

جمعیت علماء پاکستان کا قیام:

قیام پاکستان کے بعد بھی آپ نے مسلم لیگ کا ساتھ دیا لیکن قائد اعظم کی وفات کے بعد جب مسلم لیگ اصل مقصد سے منحرف ہوگئی تو آپ نے فوراً علیحدگی اختیار کی۔علماء ومشائخ اہلسنّت مملکت خداداد بنانے کے بعد اپنی خانقاہوں میں جاکر جلوہ فگن ہوگئے جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ مسلم لیگ کی قیادت نے علماء میں سے حامیان پاکستان کے بجائے مخالفین پاکستان کو دستور ساز اور دوسرے اداروں میں جگہ دی ،مسلم لیگ پر جاگیرداروں اور سرمایہ داروں کا قبضہ ہوگیا جنہیں راہ راست پر لانا یا ان سے نفاذ اسلام کی توقع کرنا فہم وفراست سے دور تھا،ان حالات کے پیش نظر آپ نے ۲۶، ۲۷، ۲۸ مارچ ۱۹۴۸ء میں جامعہ انوار العلوم ملتان میں علماء ومشائخ اہلسنت کا اجلاس بلایا جس میں ''جمعیت علماء پاکستان'' کی بنیاد رکھی گئی مولانا ابوالحسنات محمد احمد قادری امیر اور علامہ سید احمد سعید کاظمی ناظم اعلیٰ منتخب ہوئے جبکہ مولانا عبدالغفور ہزاروی ،عبدالحامد بدایونی ،مفتی صاحبداد خان اور خواجہ قمرالدین سیالوی نائب امیر قرار پائے ،نائب ناظم اعلیٰ کی ذمہ داریاں مولانا غلام معین الدین نعیمی اور مرتضیٰ خان میکش کو سونپی گئیں،مولانا تنکدر علی خان مرکزی ناظم اطلاعات چنے گئے ،اس انتخاب کے بعد جمعیت علماء پاکستان نے تبلیغی سرگرمیوں کو تیز کر دیا۔[9]

جہاد کشمیر:

۱۹۴۸ء کے اوائل میں جب اہل کشمیر نے حق خود ارادیت کے حصول کی خاطر بھارت کے خلاف جہاد کا آغاز کیا تو پاکستانی رضا کار بھی کشمیری بھائیوں کے شانہ بشانہ لڑنے کے لیے محاذ پر پہنچ گئے، تمام علماء و مشائخ اہلسنت اس بات پر متفق تھے کہ بھارت نے کشمیر پر غاصبانہ قبضہ کیا ہے اور اس کے خلاف کشمیری اور پاکستانی مجاہدین نے جس جنگ کا آغاز کیا ہے

وہ جہاد ہے لیکن مولانا مودودی کا کہنا یہ تھا کہ پاکستان کے باشندوں کے لیے اس میں حصہ لینا جائز نہیں، ان حالات میں جمعیت علماء پاکستان سے وابستہ علماء و مشائخ کیسے خاموش رہ سکتے تھے چنانچہ جمعیت علماء پاکستان کی جانب سے اسلحہ بھیجیں اور مجاہدین کی ضرورت کا ہر قسم کا سامان مہیا کرنے میں کوئی کسر نہ اٹھا رکھی۔ آپ نے ۷ نومبر ۱۹۴۸ء کو مجاہدین کشمیر کے موضوع پر موچی گیٹ لاہور میں ایک عظیم الشان کانفرنس سے خطاب کیا نیز ۲۸ نومبر ۱۹۴۸ء کو گجرات میں عظیم الشان جلسے میں اس وقت کے صدر آزاد کشمیر کیپٹن عبدالرشید کی صدارت میں آپ نے یہ سب کچھ پیش کیا، انہوں نے آپ کو خراج عقیدت پیش کیا اور مودودی صاحب کے نظریات پر تنقید کی کیونکہ وہ جنگ کشمیر کو حرام قرار دے چکے تھے۔[۱۱۰]

دستور پاکستان:

جمعیت علماء پاکستان کے قیام کے بعد جمعیت علماء پاکستان نے عوام سے رابطے کے لیے پروگرام تشکیل دیئے اور ۷ مئی ۱۹۴۸ء کو جمعیت نے پورے ملک میں یوم شریعت منایا۔ پیر محمد افضل شاہ سجادہ نشین جلالپور شریف کی جمعیت مشائخ نے بھی یوم شریعت منانے میں بھرپور تعاون کیا قرار داد اور مطالبات کی کاپیاں گورنر جنرل پاکستان قائد اعظم محمد علی جناح اور وزیر اعظم لیاقت علی خان کو ارسال کی گئیں۔ قائد اعظم کے وصال سے کچھ عرصہ قبل شاہ عبدالعلیم صدیقی جب بیرونی دوروں سے واپس تشریف لائے تو کراچی میں آپ کی صدارت میں ایک اہم میٹنگ ہوئی جس میں علامہ عبدالحامد بدایونی، علامہ سید ابوالحسنات قادری، غزالی زماں سید احمد سعید کاظمی، مفتی صاحبداد خان، خواجہ قمرالدین سیالوی، علامہ سید نعیم الدین مرادآبادی، سید محمد محدث کچھوچھوی، مولانا محمد عمر نعیمی اور مولانا غلام معین الدین نعیمی شامل تھے۔ اجلاس میں پاکستان کے لیے اسلامی دستور کا مسودہ تیار کیا گیا اور پھر مبلغ اسلام شاہ عبدالعلیم صدیقی کی قیادت میں ایک اعلیٰ سطحی وفد نے گورنر جنرل آف پاکستان قائد اعظم محمد علی جناح سے تین گھنٹے طویل ملاقات کر کے دستور کا مسودہ انہیں پیش کیا۔ قائد اعظم نے وفد کو یقین دلایا کہ میں یہ مسودہ اسمبلی میں پیش کروں گا مگر افسوس کہ آپ کی زندگی نے وفا نہ کی، یوں یہ مسودہ اسمبلی میں پیش نہ ہو سکا۔ سید محمد نعیم الدین مرادآبادی نے علماء سے ملاقاتیں کر کے مزید مشورے کئے اور

یہ ذمہ داری قبول کر لی کہ میں بہت جلد اس مسودہ کو آئینی زبان میں تحریر کر کے پیش کروں گا مگر ۲۳ اکتوبر ۱۹۴۸ء کو وہ بھی مرادآباد میں انتقال کر گئے، اس طرح یہ کام مزید موخر ہو گیا۔[۱۱۱]

لیکن اکابرین نے اپنی کوششیں ختم نہیں کیں بلکہ دستور سازی کے سلسلہ میں مصروف عمل رہے اور جب ۱۲ مارچ ۱۹۴۹ء کو دستور ساز اسمبلی نے قرارداد مقاصد منظور کی تو اس وقت جمعیت کے رہنما قاری احمد پیلی بھیتی نے اسمبلی کے اجلاس میں مبصر کی حیثیت سے شرکت کی اور قرارداد مقاصد کی حمایت میں رائے دی اس وقت جمعیت کے قائد مولانا ابوالحسنات قادری نے ایک وفد کے ساتھ کراچی جا کر وزیر اعظم لیاقت علی خان سے ملاقات کی اور اسلامی دستور کے متعلق قرارداد کے اعلان پر آمادہ کیا اور پھر علماء اہلسنت کی کوششوں سے ۱۹۵۰ء میں قرارداد مقاصد کا اعلان کر دیا گیا اور پاکستان کا نام "اسلامی جمہوریہ پاکستان" تجویز ہوا۔ ۱۰، ۱۱، ۱۲ دسمبر ۱۹۵۵ء موچی دروازہ لاہور میں مرکزی جمعیت علماء پاکستان نے علامہ ابوالحسنات صاحب کی صدارت میں عظیم الشان کانفرنس منعقد کی جس میں اسلامی قانون کے نفاذ کا مطالبہ کیا نیز پاکستان کو آئینی طور پر اسلامی جمہوریہ قرار دیا جائے اور یہ بھی اعلان کیا جائے کہ صدر مملکت مسلمان ہوگا۔ علامہ سید احمد سعید کاظمی نے کانفرنس میں قرارداد کے ذریعے کہا کہ مرکزی جمعیت کا یہ اجتماع مطالبہ کرتا ہے کہ فوری طور پر قرآن سنت کے مطابق قانون بنایا جائے اور اس کے لیے قرارداد مقاصد کو پیش نظر رکھا جائے، ملک کا سربراہ مسلمان ہوگا اور قانون سازی میں فقہ حنفی کے مطابق اقدامات کئے جائیں کیونکہ پاکستان کی اکثریت حنفی مسلمانوں پر مشتمل ہے۔[۱۱۲]

۱۹۵۵ء میں آپ جمعیت علماء پاکستان کے نائب صدر منتخب ہوئے، ۲۳ مارچ ۱۹۵۶ء کو نیا دستور بنایا گیا۔ ۱۹۶۶ء میں صاحبزادہ سید فیض الحسن کی صدارت میں جمعیت کے الیکشن میں آپ ناظم اعلیٰ منتخب ہوئے۔ ۱۹۷۷ء سے ۱۹۸۸ء تک ملک پر ضیاء الحق کی حکومت رہی جو مارشل لاء کے تحت برسر اقتدار آئے ۱۹۸۶ء میں جب سیاسی جماعتوں سے پابندی اٹھائی گئی تو جمعیت نے سیاسی جلسے کئے اس وقت آپ نے پیرانہ سالی اور شدید علالت کے باوجود ۱۸ اپریل ۱۹۸۶ء کو قلعہ کہنہ قاسم باغ میں جے یو پی کے جلسہ عام میں صدارت فرمائی اور خطاب بھی فرمایا۔[۱۱۳]

جامعہ اسلامیہ بہاولپور میں بطور شیخ الحدیث :

۱۹۶۳ء سے ۱۹۷۴ء تک گیارہ سال تک جامعہ اسلامیہ بہاولپور میں شیخ الحدیث کے منصب پر فائز رہے ،طلباء میں آپ کی مقبولیت کو دیکھ کر مخالفین نے آپ کو اس منصب سے ہٹانے لیے ہر حربہ استعمال کیا۔کبھی آپ کو ناکام کرنے لئے مخالف اساتذہ و طلباء طلز کوشش کرتے اور دوران درس حدیث سوالات کی بوچھاڑ کردی جاتی ،کبھی اسمبلیوں میں آپ کے خلاف سیاسی ریشہ دوانیوں کا سہارا لیا گیا حتٰی کہ گورنر مغربی پاکستان امیر محمد خان جب بہاولپور آئے تو ان کے سامنے آپ کے مخالفین نے درخواستوں کا پلندہ رکھ دیا جس میں آپ پر طرح طرح کے الزامات لگائے گئے مگر آپ کی علمی استعداد کی بدولت فریق مخالف کو ہر بار ناکامی کا منہ دیکھنا پڑا ۔۱۴

تحریک ختم نبوت:

مرزا غلام احمد قادیانی کے دعوئے نبوت کے ساتھ ہی اہل اسلام نے اس کا شدید زبانی وقلمی رد شروع کر دیا بالخصوص اتر پردیش میں امام احمد رضا خان بریلوی، ان کے بڑے صاحبزادے مولانا حامد رضا خان ،مشرقی پنجاب میں مولانا نواب الدین مدراسی ،مغربی پنجاب میں مولانا غلام قادر بھیروی اور شمالی پنجاب میں پیر سید مہر علی شاہ صاحب۔ سید احمد سعید کاظمی امروہہ سے پڑھ کر نئے نئے فارغ ہوئے تھے اور اسلام کے پر جوش مبلغ تھے۔اسی دور میں ایک ہندو پنڈت سے "سات جنم "کے موضوع پر مناظرہ جیت کر شہرت حاصل کر چکے تھے ۔ایک روز آپ قادیان جا پہنچے اور قادیانی مبلغین سے مناظرہ کر کے انہیں ان کے گھر میں شکست سے دوچار فرمایا۔ ۱۵

قیام پاکستان کے بعد قانونی محاذ پر تحفظ ختم نبوت کی جنگ آپ ہی نے شروع کی جس وقت آپ پاکستان مسلم لیگ صوبہ پنجاب کی مجلس عاملہ کے رکن تھے ۱۹۵۲ء کو مسلم لیگ صوبائی کونسل کے اجلاس میں آپ نے یہ مسئلہ اٹھایا اور بڑی شد ومد کے ساتھ یہ درخواست منظور کروائی کہ قادیانیوں کو کافر ومرتد قرار دیا جائے اور انہیں کلیدی عہدوں سے برطرف کیا جائے، یہی وہ نقطۂ آغاز تھا جس کی بنا پر اہل سیاست وحکومت تک یہ موثر آواز پہنچی اور بالآخر ۲۲سال کی جدوجہد کے بعد ۱۹۷۴ء میں قادیانیوں کو پاکستان کی قومی اسمبلی نے کافر اور مرتد قرار دیا۔

قومی اسمبلی میں یہ تحریک مولانا شاہ احمد نورانی نے پیش کی اور بھاری اکثریت سے منظور کرائی البتہ دیوبندی فرقے کے دوممبران اسمبلی غلام غوث ہزاروی اور عبد الحکیم نے اس قرار داد کی تائید وحمایت نہ کی۔ ۱۶

جسٹس منیر انکوائری رپورٹ صفحہ ۹ میں یہ تحریر موجود ہے کہ قیام پاکستان کے بعد قادیانیوں کو غیر مسلم اقلیت قرار دینے کی سب سے پہلی قرار داد مسلم لیگ کی صوبائی کونسل کے اجلاس میں علامہ سید احمد سعید کاظمی صاحب نے پیش کی ۱۹۵۲ء میں منعقد ہونے والے مسلم لیگ کے کسی اجلاس میں جو قرارداد پیش کی گئی اس قرارداد میں مسلم لیگی اکابرین سے کہا گیا تھا کہ وہ قادیانیت کے مضمرات اور ان کی اسلام دشمن کاوشوں سے باخبر رہیں اور انگریز کے پیدا کئے ہوئے اس فتنے کے استیصال کے لئے تمام صلاحیتیں بروئے کار لائیں ۔اس قرار داد کا مقصد یہ تھا کہ اگر پاکستان میں اسلامی نظام نافذ کرنا ہے تو ہمیں عظمت رسول ﷺ کو ہر پہلو سے مقدم رکھنا ہوگا ،اسلام حضور ﷺ کی ذات اقدس سے عبارت ہے اور آپ ﷺ کی ختم نبوت کا مسئلہ حل کئے بغیر ملک میں نظام مصطفیٰ کا نفاذ ممکن نہیں ہے۔ ۱۹۵۳ء میں جب تحریک تحفظ ختم نبوت نے زور پکڑا اور اس میں بہت سے مسلمانوں نے اپنی جانوں کے نذرانے پیش کیے تو سید احمد سعید کاظمی صاحب اس وقت جمعیت علماء پاکستان کے ناظم اعلیٰ تھے اور علامہ سید ابو الحسنات اس کے صدر تھے اس موقع مرزائیوں کو غیر مسلم اقلیت قرار دلوانے کے لیے ایک "متحدہ مجلس عمل" تشکیل دی گئی جس کے امیر متفقہ طور پر علامہ سید ابو الحسنات علیہ الرحمہ چنے گئے ،اس تنظیم نے وہ نکات بطور قرارداد منظور کر لیے جو قبلہ غزالی زماں اس سے قبل مسلم لیگ کی کونسل کے اجلاس میں پیش کر چکے تھے جن میں دیگر مطالبات کے ساتھ یہ تین اہم مطالبات بھی شامل تھے :(۱) مرزائیوں کو غیر مسلم اقلیت قرار دیا جائے۔ (۲) مرزا ظفر اللہ قادیانی کو وزیر خارجہ کے عہدے سے برطرف کیا جائے ۔(۳) قادیانیوں کو ملک کے تمام کلیدی اور اہم عہدوں سے برطرف کیا جائے۔ ۱۷

جماعت اہلسنّت:

علامہ کاظمی صاحب جماعت اہلسنّت کی سربراہی کے امتحان سے بھی گزرے ،اس کا

قیام ۱۹۷۰ء کے انتخابات سے پہلے عمل میں لایا گیا، علامہ محمد شفیع اوکاڑوی اس کے پہلے امیر تھے۔ علامہ عبدالمصطفیٰ الازہری، علامہ شاہ احمد نورانی، مفتی سعادت علی قادری، مفتی ظفر علی نعمانی بھی جماعت اہلسنت کے اکابرین میں سے تھے۔ ۱۹۷۰ء میں کراچی کے انتخابات جمعیت علماء پاکستان نے بڑی حد تک جماعت اہلسنت ہی کی بدولت جیتے۔ ۱۹۷۰ء میں ضیاء الحق کی دینی جماعتوں پر پابندی کے بعد جمعیت علماء پاکستان کے وابستگان نے جماعت اہلسنت کے پلیٹ فارم سے کام کیا۔ ۲۷ دسمبر ۱۹۸۳ء کے انتخابات میں آپ جماعت اہلسنت کے ناظم اعلیٰ منتخب ہوئے۔ ۱۹۸۶ء میں آپ جماعت کی سرگرمیوں سے علیحدہ ہو چکے تھے، یوں آپ نے ساری زندگی جمعیت علماء پاکستان اور جماعت اہلسنت میں گزار دی۔ ۱۸

متذکرہ بالا خدمات کے علاوہ آپ نے مدارس و جامعات اہلسنت کے وفاق "تنظیم المدارس"، اہلسنت وجماعت کی عالمی تبلیغی تنظیم "دعوت اسلامی" اور طلبہ اہل سنت کی تنظیم "انجمن طلبہ اسلام" کی بھی سرپرستی فرمائی، ان کے اجتماعات اور اجلاسوں میں شرکت فرما کر خطابات بھی فرمائے اور ملک کے طول وعرض میں ان تنظیموں کو متعارف کروایا جو کہ آج دینی، قومی وملی خدمات میں مصروف عمل ہیں۔ ۱۹

وفات:

۲۵ رمضان المبارک ۱۴۰۶ھ / ۱۹۸۶ء کو افطاری کے بعد وضو کراتے آپ کو لیجایا جا رہا تھا تو آپ پیچھے کی طرف تشریف لے آئے، جب دیکھا گیا تو دار فانی سے دار بقا کی طرف کوچ کر چکے تھے، نماز جنازہ آپ کے بڑے صاحبزادے علامہ سید مظہر سعید کاظمی نے پڑھائی جبکہ دعا قائد ملت اسلامیہ علامہ شاہ احمد نورانی نے فرمائی۔ آپ کی تدفین سید معصوم شاہ (ملتان) کے مزار مبارک کے احاطے میں ہوئی، یہ رمضان المبارک کی شب تھی اور اگلی صبح جمعۃ الوداع تھا۔ ۲۰

تصنیفی خدمات:

تدریس وتقریر، آستانہ وخانگی مصروفیات کے باوجود آپ نے تحریر وتصنیف کا سلسلہ جاری رکھا اور دینی، قومی وملی موضوعات پر قابل قدر علمی سرمایہ سپرد قلم کیا۔ زمانہ طالب علمی ہی

میں امتناع کذب کے موضوع پر ایک رسالہ "تسبیح الرحمٰن عن الکذب والنقصان" تالیف کیا۔ قوالی سننے کے جواز پر "مقالۃ النزاع عن مسئلۃ السماع"، حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے حاضر ناظر ہونے پر "تسکین الخواطر" (دو حصے)، حضور ﷺ کی حیات مبارکہ پر "حیات النبی"، امام جلال الدین سیوطی کے رسالہ "انباء الاذکیا" کا ترجمہ، حضور ﷺ کے سفر معراج پر "معراج النبی"، میلاد پر "میلاد النبی"، علم غیب پر "تقریر منیر"، حدیث پر "حجیت حدیث"، رد عیسائیت پر "اسلام اور عیسائیت"، مولانا مودودی کے بارے میں "مکالمہ کاظمی ومودودی"، قربانی پر "تحقیق قربانی"، حضور ﷺ کے سایہ کے بارے میں "مسئلہ ظل النبی پر تحقیقی نظر اور دلائل نفی وثبات کا جائزہ"، مسلک اہلسنت اور مسلک دیوبند کی وضاحت کے لیے "الحق المبین"، حدیث جبرائیل پر "التحریر" اور پھر اس کی شرح "التقریر"، مولانا قاسم نانوتوی کی بعض عبارات کے رد میں "التبشیر برد التحذیر" تحریر فرمائی۔ "اسلام اور سوشلزم"، "طلباء کا اسلامی کردار"، قوالی سننے کے جواز پر ایک اور رسالہ تصنیف فرمایا۔ ۲۱

مذکورہ بالا کتب ورسائل کے علاوہ ترجمہ قرآن "البیان" اور پہلے پارہ کی تفسیر "التبیان" کے نام سے تحریر فرمائی۔ ۲۲ مقالات کاظمی جلد اول میں ضرورت توحید، ضرورت نبوت، ختم نبوت، حدیث کے بارے میں تفصیلی بیان کے بعد سائنس اور مذہب، قرآن اور آسمان، شہری زندگی، تعلیم میں دینی مدارس کا حصہ اور ان کی افادیت، فقہ حنفی، کتاب التراویح پر تحقیقی مقالات رقم فرمائے۔ ۲۳ دوسری جلد میں دستور پاکستان، جمعیت علماء پاکستان کے موضوعات زیر بحث ہیں۔ ۲۴ جبکہ مقالات کاظمی جلد سوم میں عظمت نبی کی تحقیق، عصمت انبیاء، فتاوی عالمگیری کا پس منظر، اسلام میں عورت کی دیت، رجم اسلامی سزا ہے، فلسفہ نماز کے موضوعات پر مدلل گفتگو فرمائی ہے۔ ۲۵

التفسیر
علامہ احمد سعید کاظمی

حوالہ جات

(۱) سائرہ امانت علی سعیدی ،حیات غزالی زماں،ادارہ نوید سحر لاہور ۲۰۱۰ء ،صفحہ:۸۹

(۲) ایضاً،صفحہ : ۲۷_۲۹

(۳) علامہ غلام رسول سعیدی ،تعارف مصنف از مقالات کاظمی ،کاظمی پبلی کیشنز ملتان ۲۰۰۲ء ،جلد اول صفحہ :۱۲، ۱۳

(۴) سائرہ امانت علی سعیدی ،حیات غزالی زماں،ادارہ نوید سحر لاہور ۲۰۱۰ء ،صفحہ:۴۳

(۵) ایضاً،صفحہ : ۴۴ (۶) ایضاً،صفحہ : ۵۵

(۷) ایضاً،صفحہ : ۵۶ (۸) ایضاً،صفحہ : ۵۶، ۵۷

(۹) ایضاً،صفحہ : ۵۹، ۶۰ (۱۰) ایضاً،صفحہ : ۶۲

(۱۱) ایضاً،صفحہ : ۷۵ (۱۲) ایضاً،صفحہ : ۷۶

(۱۳) ایضاً،صفحہ : ۷۸، ۷۹ (۱۴) ایضاً،صفحہ : ۱۲۷_۱۳۱

(۱۵) صلاح الدین سعیدی ،شخصیات اسلام ،ادارہ نوید سحر لاہور ۲۰۱۰ء ، صفحہ : ۱۵۴

(۱۶) ایضاً،صفحہ : ۱۵۵

(۱۷) ایضاً،صفحہ : ۱۵۷_۱۶۶

(۱۸) سائرہ امانت علی سعیدی ،حیات غزالی زماں،ادارہ نوید سحر لاہور ۲۰۱۰ء ،صفحہ : ۸۰_۸۱

(۱۹) ایضاً،صفحہ : ۸۲_۸۵

(۲۰) ایضاً،صفحہ : ۱۵۷_۱۶۶

(۲۱) علامہ غلام رسول سعیدی ،تعارف مصنف از مقالات کاظمی ،کاظمی پبلی کیشنز ملتان ۲۰۰۲ء ،جلد اول صفحہ : ۲۷، ۲۸

(۲۲) سائرہ امانت علی سعیدی ،حیات غزالی زماں،ادارہ نوید سحر لاہور ۲۰۱۰ء ،صفحہ:

(۲۳) علامہ غلام رسول سعیدی ،تعارف مصنف از مقالات کاظمی ،کاظمی پبلی کیشنز ملتان ۲۰۰۲ء ،جلد اول صفحہ : ۳، ۴

(۲۴) ایضاً،حصہ دوم صفحہ : ۳

(۲۵) ایضاً،حصہ سوم صفحہ : ۳_۹

التفسیر، مجلس تفسیر، کراچی جلد۶، شمارہ۱۸، اپریل تا ستمبر ۲۰۱۲ء

محمد اسد (Former: Leopold Wesis)

سید محمد کاشف

Present article in hand is about one of the great personalities in the series of renaissance of Muslim ummah, Muhammad Asad no doubt fits in that list. He was a Jewish converted Muslim belonging to a Rabbi Family of Austria Lwow. Reason behind his accepting Islam was his influence with the culture of Arab society though it was on declining path. Finally he gets inspired and fully intended to accept Islam as a religion, without having any confusion and hesitation. For this he paid high cost of trailing all his relations including his parents but nothing could make his decisionchange.

When he was on his journey to Asian's countries, he visited Indo-Pak subcontinent, and became a part of them. Allama Iqbal was the first

man who convinced him to stay there. All famous religious personalities like Shibli Nomani, Maulana Mawdoodi etc admired his intelligence and sincerity with Islam. He played a vital role in Pakistan's movement. he wrote a great piece of work for Muslim Ummah during this movement. He also published a magazine with the title of Arafat.

He was the first Pakistani, who was issued a Pakistani passport. Thoroughout his life, he tried tirelessly for the wellbeing of Pakistan, but unfortunately he was not only suspended to work for Pakistan, but was also erased from the whole history of Pakistan's movement intentionally. Last but not the least he set an example for whole Muslims youth that only a person could do more than a group with having firm believe in religion and with trust on Allah.

ابتدائیہ

احیائے اسلام یا اسلام کی نشاۃ ثانیہ کے سلسلے میں گذشتہ چند صدیوں میں بہت سی تحریکیں اور شخصیتیں ابھری ہیں۔ لیکن ان میں سے کسی کو بھی خاطر خواہ کامیابی حاصل نہیں ہوئی۔اس ناکامی کے اسباب مختلف ہیں مگر بنیادی سبب تقلید محض کی فکر ہے۔بہر حال قابل قدر کامیابی نہ حاصل ہونے کے باوجود ان سب نے اپنے ایسے نقوش چھوڑے ہیں جنہیں فراموش نہیں کیا جاسکتا۔انہی شخصیات میں بیسویں صدی کے محمد اسد بھی ہیں۔جو کہ ایک یہودی ربی کے گھر پیدا ہوئے مگر حلقہ بگوش اسلام ہوگئے۔ان کے قبول اسلام کی بنیادی وجہ عرب اسلامی تہذیب تھی باوجود اپنی خستہ حالی اور کھوکھلے پن کے۔اور اس تہذیب نے مغرب کے پروردہ کو بغاوت پر آمادہ کیا اور اپنی ہی تہذیب سے روگردانی کرکے کسی اور ہی تہذیب کا علمدار بنادیا۔

محمد اسد نے اسلام اور مسلمانوں کا بڑی گہرائی سے مطالعہ کیا ہے۔اس مطالعہ کا موقع انھیں اپنی صحافتی زندگی میں عرب مسلم ممالک میں ٹھہرنے کے سبب حاصل ہوا۔اور مسلم تہذیب کی ہم آہنگی جس کی بنیاد ولن ،رنگ ونسل پر نہیں ہے بلکہ فکری بنیاد پر ہے ،اس ہم آہنگی کی بنیاد نے یہودی ربی کے بیٹے پر اسلام کے در وا کردیئے اور اسے اپنی آغوش میں لے لیا۔

اپنی سیاحتی زندگی میں سعودی عرب میں پانچ سال گزارنے کے بعد محمد اسد نے ہندوستان،چین وغیرہ کے دورے کا آغاز کیا اور جب وہ ہندوستان پہنچے تو اس وقت ہندوستان کی فضاء میں تحریک آزادی کی گونج جاری تھی۔ان حالات میں شاعر مشرق ڈاکٹر محمد اقبال نے ان سے ہندوستان میں ہی قیام کی درخواست کی۔اور ان کی اس دعوت پر لبیک کہتے ہوئے محمد اسد یہیں کے ہوگئے اور مرتے دم تک پاکستانی کی حیثیت سے زیست کا سفر مکمل کیا۔

محمد اسد نے گو کہ ہر لحاظ سے ایک مصلح ،مجتہد،اور لی لیڈر کا کردار ادا کیا،لیکن وہ ان میدانوں میں خاطرخواہ کامیاب نہ ہوسکے، جس کی ایک وجہ تو زبان کا فرق Communication Gap تھا۔ان کی تمام علمی کتب انگریزی زبان میں تھیں جس سے مسلمانوں کی اکثریت ناواقف تھی۔پھر ایک وجہ مسلمانان ہند کا عمومی رویہ تشکیک کہ جس نے انہیں پذیرائی نہ حاصل ہونے دی۔الغرض دیگر علمی وعملی شخصیات کی طرح پاکستان میں اور بالخصوص تحریک پاکستان کے ضمن میں (Intentionaly)ان کی شخصیت کو گوشہ گمنامی میں پہنچادیا ،تاکہ مسلمان نہ تو ان کے افکار سے واقف ہوسکیں اور نہ ہی یہ سمجھ سکیں کہ آخر اس امت کے زوال کے اسباب کیا ہیں ۔

سوانح:

نومسلم محمد اسد(سابق لیوپولڈ وائس)بیسویں صدی (1900)کے آغاز ہی میں آسٹرو ہنگرین ایمپائر کے ایک دور افتادہ علاقہ میں پیدا ہوئے اور طویل عمر پاکر اسی صدی کی آخری دہائی میں سپین کے ایک چھوٹے سے شہر(غرناطہ) میں اپنے مالک حقیقی سے جاملے (20th Febeurary,1992)۔یوں دیکھیں تو محمد اسد کی ذات قریب قریب پوری ایک صدی کا آئینہ ہے،جس میں اس دور کے نمایاں فکری رجحانات،علمی سطح پر مشرق ومغرب کی

آویزش اور ان کے تہذیبی بعد کو کم کرنے کی مختلف النوع کوششوں، دنیائے اسلام کو درپیش کوناکوں مسائل اور مروجہ سیاسی میلانات کی جھلک منعکس ہے۔

محمد اسد یہودیوں کے جانے پہچانے مبلغ خاندان کے چشم وچراغ تھے۔اسی ماحول میں ان کی چشم شعور وآگہی وا ہوئی۔اس کا اندازہ اس سے کیجئے کہ صرف 13سال کی عمر میں وہ عبرانی زبان میں گفتگو کرنے لگے تھے اور روانی سے اسے پڑھ بھی لیتے تھے۔آرامی زبان سے بھی وہ آشنا تھے اور تالمود اور بائبل کا عہد قدیم بآسانی پڑھ سکتے تھے۔(1)

پہلی جنگ عظیم 28جولائی 1914 کو شروع ہوئی اور 11نومبر 1918 کو ختم ہوئی۔اس وقت محمد اسد کی عمر چودہ سال تھی اور وہ ایک مدرسے میں ابتدائی تعلیم حاصل کررہے تھے،لیکن مدرسے کی تعلیم سے انہیں دلی لگاؤ نہ تھا۔وہ گھر سے بھاگے اور آسٹریا کی فوج میں کسی اور نام سے بھرتی ہوگئے۔والد کو پتہ چلاتو فوج کے متعلقہ افسر سے رابطہ قائم کیا اور بتایا کہ یہ بچہ کم عمر ہے،اس لئے اسے فوج میں بھرتی نہیں کیا جاسکتا،چنانچہ انہیں واپس گھر بھیج دیا گیا۔(2)

اسی اثناء میں محمد اسد کے والد ویانا چلے گئے اور آپ کو بھی اپنے ساتھ لے گئے ۔جنگ ختم ہونے کے بعد محمد اسد نے ویانا یونیورسٹی میں داخلہ لیا اور وہاں فلسفہ،تاریخ اور آرٹ کو موضوع مطالعہ بنایا۔انہی دنوں وہ فرائڈ کے نظریات سے متاثر ہوئے،لیکن یہ ان کے ذہنی اور فکری رجحانات کی تبدیلیوں کا زمانہ تھا۔اب ان کا احساس جاگ اٹھا تھا اور وہ اس نتیجہ پر پہنچے تھے کہ تمام یورپ روحانی اضطراب کا شکار ہے اور ان لوگوں نے اپنی زندگیوں کو مادی وسائل کے حصول کے لئے وقف کررکھا ہے اور دنیاوی خواہشات کی تکمیل ہی ان کا اصلی نقطہ نظر ہے۔اسد کو اب حق کی تلاش تھی اور اس تلاش میں وہ انتہائی بے قرار تھے۔وہ یہودیت اور عیسائیت وغیرہ مذاہب کی کتابوں کا مطالعہ کرتے تھے،لیکن انہیں قلبی سکون اور ذہنی اطمینان حاصل نہ ہورہا تھا ۔اس بے چینی کا اثر یہ ہوا کہ یونیورسٹی کی تعلیم جاری رکھنا ان کے بس میں نہ رہا اور انہوں نے میدان صحافت میں قدم رکھنے کا فیصلہ کیا۔(3)

بالآخر خاصی تگ ودو کے بعد انہیں جرمنی کے ایک اخبار میں ملازمت مل گئی اور وہ اس کے نامہ نگار کی حیثیت سے مشرق وسطی کے بلاد اسلامیہ کے حالات حاضرہ کے متعلق تجزیاتی

رپورٹیں بھیجنے نکل کھڑے ہوئے۔برسوں وہ فلسطین سے افغانستان تک اپنے فرائض منصبی ذمہ داری اور دیانتداری سے ادا کرتے رہے۔ان کی ارسال کردہ روداد وں کا کچھ حصہ کتابی صورت میں منظر عام پر آگیا ہے،جس کے سرسری مطالعہ ہی سے یہ حقیقت منکشف ہو جاتی ہے کہ انہوں نے ان اسلامی ممالک میں بسنے والے مسلمانوں کی روزمرہ زندگی کا کس قدر باریک بینی سے مشاہدہ کیا۔اپنی صحافتی ذمہ داریوں سے عہدہ برآ ہونے کے لیے اس شب وروز کی بادیہ پیمائی نے انہیں مسلمانوں کی عمومی زندگی سے تو آشنا کردیا،لیکن ابھی وہ امن وسلامتی کے دین یعنی اسلام کی اصل روح تک رسائی حاصل نہ کرسکے تھے۔بہرحال ان اسفار نے ان کے قلب میں نرمی اور گداز پیدا کردیا اور انہوں نے جب ام الکتاب یعنی قرآن حکیم کا بنظر غائر مطالعہ کیا تو انہیں دائرہ اسلام میں داخل ہونے میں کسی ذہنی یا جذباتی دشواری کا سامنا نہیں کرنا پڑا۔اس تبدیلی دین سے ان کے تمام خاندانی رشتے ناتے ٹوٹ گئے۔لیکن انہوں نے اس کی ذرہ بھر پروانہ کی اور اپنی نومسلم جرمن بیوی اور اس کے معصوم بچے کو لے کر حرمین شریفین کی جانب چل پڑے۔مکہ پہنچتے ہی جرمن بیوی داغ مفارقت دے گئی۔لیکن انہوں نے پامردی سے ہر طرح کے نامساعد حالات کا مقابلہ کیا۔

اپنے قبول اسلام کے ضمن میں وہ ان واقعات کا ذکر کرتے ہیں جس نے انہیں حد سے زیادہ متاثر کیا،ان واقعات میں وہ عرب معاشرت کے بنیادی اخلاقی رویوں سے ایسے متاثر ہوئے کہ جس نے ان کی بے چین روح کو قرار کی جائے پناہ تک کی راہ سجھائی۔جب وہ بذریعہ ٹرین اسکندریہ سے بیت المقدس جارہے تھے تو ان کے ہم سفر ایک عرب بدو نے کسی اسٹیشن سے روٹی خریدی۔اس نے روٹی کے دو ٹکڑے کیے اور ایک میری (محمد اسد) جانب بڑھادیا،میں نے لینے میں تامل کیا تو اس نے مسکرا کر کہا کہ جب ہم دونوں ہی مسافر ہیں اور ایک ہی راستے پر اکٹھے چل رہے ہیں تو یہ بیگانگی کیوں؟۔(4)اسی طرح وہ بیان کرتے ہیں کہ جب وہ مصر (1923)میں تھے اور جس جگہ ان کی رہائش تھی وہیں قریب میں مسجد بھی موجود تھی تو روزانہ صبح شام موذن کی آواز اور مسلمانوں کو نماز پڑھنے جاتا دیکھتے تو وہ سوچتے کہ ،یہ طے شدہ بات ہے کہ اسلامی ممالک میں ہر جگہ یہی لہجہ اور یہی آہنگ مجھے ملے گا۔اس فرق کے باوجود جو مختلف

مقامات کی مقامی زبانوں اور لہجوں میں ہوتا ہے،ایک ایسا صوتی اتحاد اور یگانگت جسے دیکھ کر مجھے اندازہ ہوا کہ مسلمانوں کا اندرونی اتحاد، یکسانیت ،اور ہم آہنگی کتنی گہری ہے اور ان کو تقسیم اور متفرق کرنے کی چیزیں کتنی مصنوعی ،سطحی اور بے اثر ہیں۔اپنے عقیدے،طرز فکر حق وباطل کی تمیز بہتر اور صحیح زندگی کے مزاج اور بناوٹ کو سمجھنے میں وہ ایک انسان کی مانند تھے مجھے پہلی بار ایسا لگا کہ میں نے ایک ایسی سوسائٹی میں رکھا ہوں جس میں انسان کے درمیان رشتہ اور تعلق کی بنیاد اقتصادی مصالح یا رنگ ونسل پر نہ تھی،بلکہ اس سے زیادہ گہری مضبوط اور پائیدار چیز پر تھی، وہ زندگی کے متعلق اس مشترک نقطہ نظر کا رشتہ تھا جس نے دو انسانوں کے درمیان سے بیگانگی اور بے تعلقی کی تمام دیواروں کو گرادیا تھا۔(5)

سعودی عرب میں اپنے پانچ سالہ قیام (1927-1932)کے دوران میں انہیں وہ سب کچھ ملا، جس کی ایک انسان خواہش کرسکتا ہے۔سب سے بڑی تو ایمان کی دولت تھی جو پروردگار نے انہیں فراوانی سے عطا کردی تھی۔لیکن اس کے ساتھ ہی پروردگار نے انہیں ایک سیلانی روح بھی دے رکھی تھی۔جو انہیں کہیں جم کر نہیں بیٹھنے دیتی تھی۔بالآخر اس سیلانی روح نے انہیں ایک بار پھر سیاحتی سفر کے آغاز پر مجبور کیا اور وہ اپنی عرب بیوی اور شیر خوار بچے کو لے کر چین ہشرقی ترکستان وغیرہ کی سیاحت کو چل پڑے۔اس طویل سفر کا پہلا پڑاؤ ہندوستان تھا۔خوش قسمتی سے یہاں ان کی ملاقات علامہ اقبال سے ہوئی،جنھوں نے اپنی چشم بینا سے اس نومسلم اور نووارد کے قلب وذہن میں پوشیدہ نظری جوہر کو پہچان لیا اور اسے ایک ایسی راہ سجھائی ،جو اس کی زندگی میں ایک اہم موڑ ثابت ہوئی۔اقبال کے مخلصانہ مشورے کا فوری اثر یہ ہوا کہ اسد جن ممالک کی سیاحت کے لیے رخت سفر باندھ کر چلے تھے وہ کہیں کونے میں ہی پڑا رہ گیا اور انہوں نے اپنے قوائے ذہنی وباطنی دین اسلام کی خدمت اور اپنے خیر خواہ یعنی اقبال کے خواب کو حقیقت کا روپ دینے لیے وقف کردیئے۔

سید سلیمان ندوی اسد کے بارے میں لکھتے ہیں کہ ہم کو اپنے تمام نومسلم بھائیوں میں سے سب سے زیادہ جس شخصیت نے متاثر کیا ہے وہ آسٹریا کے ایک گمنام نومسلم لیوپولڈوائس معروف بہ محمد اسد ہیں۔وہ ایک ایسے نومسلم نظر آئے جن کو دیکھ کر مغرور پشتینی

مسلمانوں کو شرمانا چاہیے۔وہ نہ صرف عقیدہ کے مسلمان ہیں، بلکہ فرائض وسنن ومستحبات اور تمدن ومعاشرت تک میں مسلمان ہیں۔ یہ وہ یورپین ہیں جو نہ صرف مسیحی عقیدہ کے بلکہ یورپین تمدن کے بھی مخالف ہیں۔(6)بقول مولانا مودودی ……دورِ جدید میں اسلام کو جتنے غنائم یورپ سے ملے ہیں، ان میں محمد اسد سب سے قیمتی ہیرا ہیں۔ اور اس ہیرے کو جس جوہری نے سب سے پہلے پہچانا، وہ علامہ اقبال تھے۔(7)جب اسد نے برصغیر ہی میں مستقل قیام کا فیصلہ کرلیا تو اقبال کو ان کے لیے کوئی ڈھب کی ملازمت تلاش کرنے کی فکردامنگیر ہوئی۔انہوں نے مقدور بھر کوشش کی کہ انہیں اسلامیہ کالج (لاہور) کے شعبہ اسلامیات کا سربراہ مقرر کردیا جائے لیکن وہ بعض وجوہ کے سبب کامیاب نہ ہوسکے۔ابتدائی ملاقاتوں میں اقبال نے اسد کو صحیح بخاری کے انگریزی ترجمہ وشرح کی تجویز پیش کی، جس کو اسد نے قبول کرتے ہوئے اس کو ایک بڑے منصوبے کی حیثیت سے شروع کردیا۔صحاح ستہ کے کسی مجموعہ احادیث کو انگریزی میں منتقل کرنے کی یہ اولین کوشش تھی۔ ترجمہ کے علاوہ اس کے طباعتی اخراجات کے لئے اقبال نے اپنا اثر و رسوخ استعمال کیا اور اکبر حیدری کے توسط سے نظام دکن سے خاصی معقول رقم کا بندوبست ہوگیا۔اس کے بعد ترجمہ وطباعت کے مراحل بلارکاوٹ تیز رفتاری سے آگے بڑھنے لگے۔

انہی دنوں اقبال کی تجویز پر دارالسلام (جمال پور، پٹھان کوٹ) کے قیام کا مسئلہ زیرِ غور تھا اور اقبال چاہتے تھے کہ ان کے اس brain-child کی دیکھ بھال کی ذمہ داری اسد ہی کو سونپی جائے، لیکن حیدرآباد دکن کے انگریزی سہ ماہی مجلہ **اسلامک کلچر** کا مدیر مقرر ہونے کی وجہ سے انہیں اقبال سے معذرت کرنا پڑی چنانچہ مولانا مودودی کو اس عہدے کے لئے نامزد کردیا گیا۔روز بروز بڑھتی ہوئی علالت کے باعث اقبال جمال پور میں قائم ہونے والے ادارے کے لیے زیادہ فعال کردار ادا نہ کرسکے، لیکن اسد کی مشاورت اور اولین رکن ہونے کی حیثیت سے ہونے والی پیش رفت سے انہیں مطلع کرتے۔ساتھ ساتھ لاہور میں مقیم جرمن ڈاکٹروں سے اقبال کا علاج بھی کراتے رہے، لیکن ایک روز اپنے ہی قائم کردہ پریس میں مصروف کار تھے کہ انہیں اقبال کے انتقال پر ملال کی خبر ملی تو انہیں یوں محسوس ہوا جیسے اس کے گرد تاریکی کے بادل چھاگئے ہوں۔(8)

اقبال تو اس دارِ فانی سے رخصت ہوگئے، لیکن انہوں نے اسد کو جو راہ بھائی تھی، ایک تلمیذ رشید کی طرح وہ اس پر گامزن رہے۔ اقبال کی فرمائش پر انہوں نے صحیح بخاری کا جو انگریزی ترجمہ شروع کیا تھا، وہ اسی کو آگے بڑھانے میں مصروف رہے۔ان کا ارادہ اسے چالیس حصوں میں مکمل کرنے کا تھا،لیکن ابھی اس کے پانچ حصے ہی اشاعت پذیر ہوئے تھے کہ دوسری جنگ عظیم چھڑ گئی اور انہیں گرفتار کرکے ہندوستان میں مقیم ہزاروں جرمن اور اطالوی قیدیوں کے کیمپ میں نظر بند کردیا گیا۔(یکم ستمبر 1939)ان کے نجی پریس کو تالا لگادیا گیا۔صحیح بخاری کے ترجمہ کے مسودات وہیں پڑے رہے۔بیوی اور بیٹے نے چودھری نیاز علی خان کے گھر پناہ لی۔طویل نظر بندی کے بعد انہیں جب رہا کیا گیا (14اگست،1945)تو ہندوستان کا سارا منظر نامہ ہی تبدیل ہوچکا تھا۔وہ چاہتے تو صحیح بخاری کے ادھورے کام کو دوبارہ شروع کرسکتے تھے، لیکن اب حالات کچھ ایسا رخ اختیار کرچکے تھے کہ انہوں نے اس منصوبے کو موخر کردیا اوراقبال نے برصغیر کے مسلمانوں کے لئے جس علیحدہ مملکت کا خواب دیکھا تھا، اس کو حقیقت کا روپ دینے کے لیے اپنی تمام صلاحیتوں کو بروئے کار لانے کا مصمم ارادہ کرلیا۔وہ بمبئی کے قریب واقع نظر بندوں کے کیمپ سے رہا ہوتے ہی ڈلہوزی (موجودہ ہماچل پردیش، بھارت) پہنچے اور آتے ہی عرفات کے نام سے سہ ماہی انگریزی مجلّہ کا اجراء کیا۔جولائی 1947 تک اس مجلّہ کے اکثر مضامین اسد ہی کے تحریر کردہ تھے۔ان مضامین کے سرسری مطالعہ سے ہی اس بات کا علم ہوجاتا ہے کہ اقبال نے اسد کو جس منزل کی نشاندہی کی تھی، وہ انہیں اب بالکل سامنے دکھائی دے رہی تھی۔انہوں نے اس مجلّہ کا جو نام رکھا یعنی عرفات اس میں بھی اقبال کی سوچ کارفرما ہے یعنی اتحاد بین المسلمین یا پاسبانی حرم کے لئے کرہ ارض پر بسنے والے تمام مسلمانوں کا یکجا ہونا۔ان کی نظر میں یہ صرف ایک ایسا وسیع وعریض میدان نہیں ہے، جہاں حجاج کرام اکٹھے ہوتے ہیں، بلکہ یہ ایک علامت ہے، پوری دنیا کے مسلمانوں کی باہمی اخوت، بھائی چارے، یگانگت اور ایک جگہ اکٹھے رہنے کی۔

محمد اسد اپنے دیرینہ دوست مولانا مودودی، ان کے چند رفقاء اور دیگر ساتھیوں کو بذریعہ ٹرک جمال پور، پٹھان کوٹ سے بحفاظت لاہور لے آئے۔یہاں پہنچتے ہی انہوں نے نجی

سطح پر اور پھر حکومت پنجاب کے قائم کردہ محکمہ احیائے ملت اسلامیہ کے سربراہ کی حیثیت سے نئی اسلامی مملکت کے دینی نظریاتی اور آئینی تقاضوں کو پورا کرنے پر فوری توجہ دی۔ستمبر 1947میں انہوں نے ریڈیو پاکستان (لاہور سینٹر) سے جو سات تقریریں نشر کیں،ان سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ استحکام پاکستان کے لیے کن عوامل کو لازمی قرار دیتے ہیں۔اپنے محکمہ سے انہوں نے جس مجلّہ کا اجراء کیا،اس کا نام بھی عرفات رکھا۔اس کا ایک ہی شمارہ شائع ہوا اور اس میں بھی انہوں نے آئین سازی پر ایک طویل اور فکر انگیز مقالہ لکھا،جس میں ایک نئے اسلامی ملک کی بنیادی دستاویز یعنی آئین کا خاکہ پیش کیا گیا ہے۔بدقسمتی سے ہم اس خاکے میں رنگ نہ بھر سکے اور برسوں یہ سرزمین بے آئین رہی، حالانکہ محمد اسد چاہتے تھے کہ اس اہم مسئلہ کو ایک ڈیڑھ برس میں نپٹا دیا جائے۔

محمد اسد اگر مذکورہ بالا محکمہ میں کچھ دیر اور سربراہ رہتے تو شاید یہ کام بھی کر جاتے، لیکن پاکستان کے پہلے وزیر اعظم لیاقت علی خاں نے انہیں فوراً وزارت خارجہ میں ایک اہم عہدے پر تعینات کردیا اور پھر انہیں اقوام متحدہ میں بطور مختار کل سفارت کار امریکہ بھجوادیا گیا۔یہاں اس بات کا تذکرہ بے محل نہ ہوگا کہ وزارت خارجہ میں ملازم ہونے تک اس کے پاس ان کے آبائی ملک یعنی آسٹریا کا پاسپورٹ تھا۔لیکن جب انہیں ایک سرکاری وفد میں نمائندہ پاکستان کی حیثیت سے ایک اہم ذمہ داری سونپ کر مشرق وسطی کے اسلامی ممالک بھیجا جانے لگا،تو انہوں نے اپنے افسران بالا کو متوجہ کیا کہ ان کے پاس ابھی تک آسٹرین پاسپورٹ ہے اور انہیں یہ عجیب سا محسوس ہوتا ہے کہ اس پاسپورٹ پر پاکستان کی نمائندگی کی جائے۔چنانچہ لیاقت علی خان کی خصوصی ہدایت پر انہیں جو پاسپورٹ جاری کیا گیا۔اس پر پاکستانی شہری درج تھااور یہ پہلا پاسپورٹ تھا جو تشکیل پاکستان کے بعد کسی شہری کو دیا گیا۔اس اعتبار سے دیکھا جائے تو اسد پہلے شخص ہیں، جن کو پاکستانی پاسپورٹ جاری ہوا،اور انہوں نے بھی اس کی یوں قدر کی کہ مرتے دم تک اپنی اس پاکستانی شہریت سے دستبردار نہیں ہوئے۔

وزارت خارجہ میں ایک اعلیٰ افسر کی حیثیت سے انہوں نے نوزائیدہ مملکت پاکستان کے دیگر اسلامی ممالک بالخصوص سعودی عرب سے دوستانہ تعلقات استوار کرنے میں جو خدمات

سرانجام دیں ،وہ لائق صد تحسین ہیں۔افسوس کہ وہ زیادہ دیر تک اس ملک سے اپنے سرکاری تعلق کو برقرار نہ رکھ سکے، ان کے اردگرد سازشوں اور بے بنیاد افواہوں کا ایک ایسا جال بچھادیا گیا ،کہ اس سے رہائی کے لیے ان کے پاس سوائے مستعفی ہونے کے اور کوئی متبادل راستہ نہ رہا۔رہی سہی کسر پنجاب یونیورسٹی کے ارباب بست وکشاد نے پوری کردی ،جن کی دعوت پر وہ لاہور میں ایک بین الاقوامی اسلامی کانفرنس کے انعقاد کے لیے پون برس تک انتھک محنت کرتے رہے اور ان کی امریکی بیوی پولا حمیدہ اسد (م۔2007)بطور سیکریٹری ان کے ساتھ بلا تنخواہ کام کرتی رہی۔تعجب ہے کہ جب تمام انتظامات مکمل ہوگئے اور مختلف ممالک کے مدعوئین کو ہوائی ٹکٹ بھی ارسال کردیئے گئے تو انہیں بیگم سمیت استعفیٰ دینے پر مجبور کردیا گیا۔اس پر مستزاد یہ کہ جب اس کانفرنس کی روداد اور پیش کردہ مقالات کتابی صورت میں شائع ہوئے (1960)تو اس میں محمد اسد کا کہیں نام تک موجود نہ تھا۔ان کے محبوب ترین ملک یعنی پاکستان کے اس طرز سلوک نے انہیں چونکا تو دیا۔لیکن اس کے باوجود انہوں نے اپنی آرزوؤں کے اس مسکن سے ایام جوانی میں جو جذباتی تعلق قائم کیا تھا ،اس میں فرق نہیں آنے دیا۔ادھر سے وقفے وقفے سے گرم ہوائیں تو چلتی رہیں،لیکن محمد اسد نے ان کا مردانہ وار مقابلہ کیا اور اس خطے سے اپنی محبت کی شمع کو روشن رکھا۔دیکھا جائے تو وہ حقیقی معنوں میں محسن پاکستان تھے اور انہیں بلاشبہ Intellectual Founder of Pakistan کہا جاسکتا ہے۔

پولا حمیدہ اسد اپنی ایک غیر مطبوعہ تحریر میں لکھتی ہیں :

انہیں پاکستان دل وجان سے عزیز تھا۔وہ تصور پاکستان سے محبت کرتے تھے ، حالانکہ اس ملک نے ان کے ساتھ معاندانہ رویہ اپنایا،لیکن وہ کبھی اس طرز سلوک کے شاکی نہیں رہے، وہ پاکستان کے پہلے شہری تھے اور آخری عمر تک انہوں نے پاکستان کے ساتھ گہرا تعلق قائم و دائم رکھا۔

پاکستان کے علاوہ اسد اگر کسی اور ملک سے ٹوٹ کر محبت کرتے تھے تو وہ سعودی عرب تھا۔کیونکہ بقول پولا صاحبہ پاکستان سے ان کی محبت کا تعلق دماغ سے تھا اور سعودی عرب سے دل کا۔ان کی بہت سی یادیں اس ارض پاک سے جڑی ہوئی تھیں۔ان کی پہلی نومسلم جرمن

بیوی کا مکہ میں انتقال ہوا(1927)اور اسے وہیں دفن کرنا پڑا۔دوسری بیوی منیرہ بنت حسین (م۔1976)کا تعلق یمن کے ایک قبیلہ سے تھا۔جس کے بطن سے مدینے میں خلال کی ولادت ہوئی (1932)سعودی عرب کے بانی شاہ عبدالعزیز بن سعود (م۔1953)انہیں اپنا بیٹا سمجھتے تھے اور اسی وجہ سے وہاں کے شاہی خاندان بالخصوص شاہ فیصل نے ان کی عزت افزائی میں کوئی کسر اٹھا نہیں رکھی۔سعودی عرب میں اپنے پانچ سالہ قیام میں متعدد بار سوخ اشخاص سے ان کے دوستانہ مراسم تھے،لیکن ان سب سہولتوں اور آسائشوں کے علی الرغم انہیں اس ملک سے نظری لگاؤ تھا۔جب بھی وہ یہاں آتے مغربی لباس پہننا چھوڑ دیتے عربی زبان ہی میں گفتگو کرتے اور یہاں کے طرز زندگی کو اپنا لیتے۔پولا حمیدہ اسد نے تو ایک جگہ لکھا ہے کہ ان کی روح بدوی تھی اور صحرا کی تاحدنظر پھیلی ہوئی دنیا میں خود کو یوں محسوس کرتے ،جیسے اپنے ہی گھر میں مقیم ہیں۔جوانی میں اسد جرمنی کے ایک اخبار Frankfurter (Allgemeine) Zeitung میں بطور نمائندہ برائے مشرق وسطی ملازم رہے۔اسی اخبار کے معتبر لکھاری کارل گیئٹر سیمون نے ان کی وفات سے چار سال قبل دونوں میاں بیوی کا انٹرویو لیا۔سیمون کے ایک سوال کے جواب میں پولا صاحبہ نے کہا:

(9) ۔He is a Bedouin, who have always wandered.

تصنیفات:

Road to Makkah (Published in 1954)

یہ کتاب بارہ ابواب پر مبنی ہے اور وہ درج ذیل ہیں،

پیاس، آثار شاہراہ، ہوائیں، آوازیں، روح وجسم ،خواب، درمیان، اجنہ، فارسی خطوط،دجال، جہاد، اختتام شاہراہ

The Message of the Quran

Translation and Commentry on Sahih Bukhari(Five Parts)

This Law of Ours

Islam at the Crossroads (Published in 1934)،

یہ کتاب 141 صفحات اور آٹھ ابواب پر مشتمل ہے اور وہ آٹھ ابواب یہ ہیں۔

1. The Open Road of Islam; اسلام کا کھلا راستہ

2. The Spirit of the West; مغرب کی روح

3. The Shadow of the Crusades; صلیبی جنگوں کے سایہ

4. About Education; کچھ تعلیم کے بارے میں

5. About Imitation; کچھ تقلید کے بارے میں

6. Hadith and Sunnah; حدیث اور سنت

7. The Spirit of Sunnah; سنت کی روح

8. Conclusion.

9.The Principles of State and Government In Islam

ہم پاکستان کیوں بنانا چاہتے ہیں؟(مجلہ عرفات ،مئی 1947)

پاکستان کی انفرادیت، فرادیت اور خودفہمی،فیصلہ کی گھڑی آن پہنچی ،ہمارا اخلاقی قدوقامت،پاکستان کی تعمیر قیادت اور عوام میں عدم یکسانیت۔اس مضمون کے بنیادی نکات ہیں۔(10)

اسلام کیا کہتا ہے؟(شاہکار میگزین مئی 2001)

انسان اور کائنات کا باہمی تعلق، مذاہب کا باہمی تعلق ،مذہب اور انسان دوستی،مذہب اور معاشرہ۔جیسے موضوعات پر بنیادی سوالات اٹھائے ہیں اور ان کے جوابات دینے کی کوشش کی گئی ہے۔(11)

اصول دستور اسلامی (مجلہ عرفات ،مارچ 1947)

مضمون ہذا میں جن اہم ذیلی موضوعات پر مصنف نے گفتگو کی ہے وہ یہ ہیں،دستوری

"تشکیلات، بنیادی اصول شریعت اسلامی کا مسئلہ، مسلمانوں کی قانون سازی، سربراہ ریاست، استبداد یا شوریٰ؟ شوریٰ، دستور کی محافظت، آزادیِ رائے، مذہب اور تعلیم، ریاست اور شہری۔ (12)

احیائے ملتِ اسلامیہ، (مجلہ عرفات، مارچ 1948)

اس مضمون میں مختصراً جن اداروں کے قیام اور احیاء کی ضرورت ہے اس کی نشاندہی کی گئی ہے۔ ان میں تعلیم کا نظام، مرکزی دارالعلوم کا قیام، شریعت و احیائے ملی، اسلامی فقہ اور اسلامی معاشیات، اوقاف کی تنظیم اور اخلاقِ ملی جیسے بنیادی موضوعات پر روشنی ڈالی گئی ہے۔(13)

حوالہ جات

1۔ Road to Makkah، محمد اسد، ترجمہ: طوفان سے ساحل تک، مترجم محمد احسن بٹی، طبع عکسی، کراچی ۱۹۹۴ء، ماخوذ از محمد اسد۔ ایک یورپین بدوی، ترتیب و تدوین محمد اکرم چغتائی، طبع اول 2009ء، ناشر پاکستان رائٹرز کوآپریٹو سوسائٹی، طابع مکتبہ جدید پریس لاہور، ص: 17۔

2۔ محمد اسد۔ ایک یورپین بدوی، ص: 18

3۔ محمد اسد۔ ایک یورپین بدوی، ص: 18-21 بالاختصار

4۔ محمد اسد۔ ایک یورپین بدوی، ص: 37-38

5۔ محمد اسد۔ ایک یورپین بدوی، ص: 47

6۔ معارف اعظم گڑھ اکتوبر 1934 ص: 242-243 ماخوذ از ایک یورپین بدوی ص: 394-395

7۔ محمد اسد۔ ایک یورپین بدوی، ص: 8

8۔ محمد اسد۔ ایک یورپین بدوی، ص: 8

9۔ محمد اسد۔ ایک یورپین بدوی، ص: 10-12 بالاختصار

10۔ شاہکار میگزین مئی 2001 ص: 16-22 ماخوذ از ایک یورپین بدوی ص: 292-308 (اب باضابطہ کتابچہ کی صورت میں بھی شائع ہو گیا ہے)

11۔ شاہکار میگزین مئی 2001 ص: 4-16 ماخوذ از ایک یورپین بدوی ص: 361-384

12۔ عرفات مارچ 1947 ماخوذ از ایک یورپین بدوی ص: 252-290

13۔ عرفات مارچ 1948 ماخوذ از ایک یورپین بدوی ص: 243-251

التفسیر، مجلس تفسیر، کراچی جلد ۹، شمارہ ۱۸، اپریل تا ستمبر ۲۰۱۲ء

جسٹس پیر محمد کرم شاہ الازہری

ڈاکٹر شاکر حسین خان

Justice Peer Mohammad Karam Shah Al-Azhari was an uncontroversial, literary, spiritual man and a true leader of Muslims. He performed religious and national services on national and international level. This article is not simply based on his exaltation while it is rather a research work on him.

Peer Sahab was thought Hashmi by his believers but according to my research he was Qurashi. His duration of stay in Egypt is cited different and his tenure of judiciary is stated differently but I have a different view. His judicial decisions are told in dozens but to me his total judicial decisions are not more than a dozen. I have proved it with concrete arguments that Peer Sahab was a great literary and spiritual peronality. He was a true invitee of unity of

Ummah. There is no contradiction in his sayings and acts. His thoughts and philosophy is valued to be followed.

جسٹس پیر محمد کرم شاہ الازہری المعروف ضیاء الامت کی شخصیت علمی، دینی اور روحانی حلقوں میں کسی تعارف کی محتاج نہیں، وہ ۲۱ رمضان المبارک ۱۳۳۶ہجری بمطابق یکم جولائی ۱۹۱۸ء شب دوشنبہ (پیر) بعد از صلوٰۃ التراویح (۱) بھیرہ، ضلع سرگودھا میں قریشی خاندان کے مذہبی گھرانے میں تولد ہوئے پیر صاحب کا سلسلہ نسب شیخ بہاء الدین زکریا ملتانی سے ہوتا ہوا صحابی رسول محترم ہبار (ابن الاسود بن مطلب بن اسد بن عبد العزیٰ بن قصی) سے جاملتا ہے۔(۲)

شیخ ملتانی کے آباؤ اجداد عربی النسل اور خاندان قریش سے تھے بعض سوانح نگاروں نے شیخ ملتانی کو ہاشمی تصور کیا ہے "آپ ہاشمی ہیں اور ہاشمی ہونے میں کوئی شک وشبہ نہیں"(۳) یہ تصور غلط فہمی کی بنا پر قائم کیا گیا ہے یہی نہیں بلکہ "پنجاب چیف اور پنجاب گزیٹر (Gazetteer) ملتان ڈسٹرکٹ اور کننگھم کی رپورٹ میں حضرت بہاء الحق کو اسدی الہاشمی ظاہر کیا گیا ہے محمد شاہ اور نادر شاہ کے ایک مشترک اعلانیہ میں جس پر ۱۱۷۵ء کی تاریخ ثبت ہے اس میں بھی آپ کو اسدی الہاشمی تسلیم کیا گیا ہے"(۴)

شیخ ملتانی کو ہاشمی تصور کرنا محبت وعقیدت پر مبنی ہے اس کا حقیقت سے کوئی تعلق نہیں۔ "پروفیسر مولوی محمد شفیع مرحوم سابق پرنسپل اورینٹل کالج، لاہور نے اپنے مقالہ "الشیخ الکبیر بہاء الدین زکریا ملتانی" میں بھی آپ کو اسدی ہاشمی تسلیم کیا ہے"(۵)

راقم کے نزدیک ہاشمی صرف وہی ہے جو جناب عبدالمطلب بن ہاشم کی اولاد سے ہو۔ "ابن قتیبہ نے اپنی کتاب "المعارف" میں لکھا ہے کہ عبدالمطلب کی اولاد کے سوا دنیا میں کوئی ہاشمی نہیں عبدالمطلب بن ہاشم سے ہاشمی نسل چلی، ہاشم کے باقی بیٹے مقطوع النسل تھے، یہی نظریہ "تاریخ الخمیس" اور روضۃ الاحباب" کا بھی ہے۔(۶)

ابن حجر عسقلانی نے اپنی تصنیف (۷) میں پانچ ایسے اشخاص کا تذکرہ کیا ہے جن کے نام ہبار ہیں وہ یہ ہیں: ۱۔ہبار بن الاسود ۲۔ہبار بن سفیان ۳۔ہبار بن سیکی

۴۔ہبار بن ابی العاص ۵۔ہبار بن وہب

ان تمام صاحبان کا تعلق حضرت عبدالمطلب بن ہاشم سے نہیں اس لیے ان میں سے کوئی بھی ہبار ہاشمی نہیں۔ شیخ ملتانی کا شجرہ نسب حضرت ہبار بن الاسود بن الاسد بن عبدالعزیٰ بن قصٰی سے جاملتا ہے اس لیے شیخ ملتانی قریشی الاسدی ہیں۔ الاسدی الہاشمی نہیں، حضرت ہبار کا تعلق اسد بن عبدالعزیٰ سے ہے اسد بن ہاشم سے نہیں۔ اسد بن ہاشم کی صرف ایک بیٹی تھی ان کا نام فاطمہ بنت اسد ہے جوکہ جناب علی بن ابی طالب کی والدہ ہیں۔ تحریر کردہ دلائل سے یہ بات روز روشن کی طرح عیاں ہوگئی کہ شیخ ملتانی قریشی ہیں اور پیر کرم شاہ شیخ ملتانی کی اولاد سے ہیں۔ غلط فہمی کی بناء پر ہی پیر صاحب کو بھی ہاشمی لکھا اور پکارا گیا جو غیر صحیح ہے۔

پیر صاحب کا نام ''محمد کرم شاہ'' ان کے دادا، پیر امیر شاہ (متوفی ۱۳۳۶ھ) نے تجویز کیا تھا۔ نام رکھنے کی وجہ تسمیہ یہ بیان کی گئی کہ ''پیر کھارا کوہستان نمک کے دامن میں ایک گاؤں ہے جو ''پیر کرم شاہ'' المعروف ٹوپی والے'' کے فیض کی وجہ سے مرجع خلائق ہے اس ہستی کے ساتھ ان کے خانوادہ کی رشتہ داری بھی ہے اس لیے آپ کے جد امجد نے انہی کی نسبت سے آپ کا نام محمد کرم شاہ رکھا۔(۸)

خاندان کی روایت کے مطابق تعلیم کا آغاز قرآن کریم سے ہوا۔ اسکول کی ابتدائی تعلیم، محمدیہ غوثیہ پرائمری اسکول سے حاصل کی جس کو ان کے والد پیر محمد شاہ (متوفی ۱۹۵۷عیسوی) نے ۱۹۲۵ء میں قائم کیا تھا۔ پیر صاحب اس اسکول کے پہلے طالب علم تھے اس وقت ان کی عمر سات سال تھی۔ ۱۹۳۶ء میں گورنمنٹ ہائی اسکول بھیرہ سے میٹرک کیا۔(۹) پیر صاحب اسکول میں تعلیم حاصل کرنے کے ساتھ اپنے والد کے قائم کردہ دارالعلوم محمدیہ غوثیہ (قائم شدہ ۱۹۲۵ء) بھیرہ میں دینی تعلیم بھی حاصل کرتے رہے۔ ۱۹۴۰ء میں انہوں نے انٹر میڈیٹ کا امتحان پاس کیا۔(۱۰)

فاضل عربی کے لیے انہوں نے ۱۹۴۱ء میں اورینٹل کالج لاہور میں داخلہ لیا اور

امتحان ۶۰۰ میں سے ۵۱۲ نمبر لیکر فرسٹ ڈویژن میں پاس کیا اور پورے پنجاب میں پہلی پوزیشن حاصل کی پھر ضلع ہزارہ کے شہر مانسرہ پہنچے اور وہاں مولانا حمید الدین سے اصول فقہ کے اسباق پڑھے۔(۱۱)

۱۹۴۲ء میں دورہ حدیث کے لیے مرادآباد گئے جہاں انہوں نے سید نعیم الدین مرادآبادی سے دورہ حدیث کی چند کتابیں پڑھیں باقی کتابیں مولانا محمد عمر (والد مفتی اطہر نعیمی) سے پڑھیں۔ تکمیل ہوئی تو دیوان آل رسول سید اجمیری نے دستار باندھی۔ سند دیتے ہوئے علامہ مرادآبادی نے کہا ''میں آج مطمئن ہوں کہ میرے پاس دینی علوم اور حدیث طیبہ کی جو امانت تھی وہ میں نے موزوں فرد تک پہنچادی۔(۱۲)

پیر صاحب نے مراد آباد سے آنے کے بعد ۱۹۴۵ء میں پنجاب یونیورسٹی سے بی۔اے کا امتحان پاس کیا(۱۳) ۱۹۴۸ء میں رشتہ ازدواج سے منسلک ہوئے۔(۱۴) ان کا نکاح سجادہ نشین آستانہ عالیہ سیال شریف قمرالدین سیالوی نے پڑھایا۔

پیر صاحب کے والد کی خواہش تھی کہ ان کا بیٹا مزید تعلیم حاصل کرنے کے لیے جامعہ ازہر (مصر) جائے چناں چہ وہ مئی ۱۹۵۱ء میں جامعہ ازہر مصر چلے گئے۔(۱۵) جہاں انہوں نے تین سال دو ماہ (جون ۱۹۵۱ تا جولائی ۱۹۵۴ء) قیام کیا۔ ان کے بعض مدح سراؤں نے قیام مصر کا دورانیہ بیان کرنے میں غیر ذمہ داری کا ثبوت دیا ہے۔ درست وہی ہے جو راقم نے تحریر کیا ہے۔ پیر صاحب نے جامعہ قاہرہ میں بھی داخلہ لیا تھا۔(۱۶) اور شام کے اوقات میں جامعہ فواد بھی لیکچر سننے جاتے تھے(۱۷) پیر صاحب اپنی تحریرات ومکتوبات میں اپنے آپ کو ایم۔اے جامعہ ازہر ہی ظاہر کرتے تھے۔ پیر صاحب کا یہ طریقہ رہا کہ جہاں فرصت ہوئی وہاں کچھ نہ کچھ سیکھ لیا یہی وجہ ہے کہ انہوں نے پاکستان کے مختلف دیہات اور شہروں کا دورہ کیا اور وہاں کے علماء سے درس لیا یہی طریقہ انہوں نے مصر میں بھی جاری رکھا۔

پیر صاحب نے قیام مصر کے دوران تصانیف وتالیف کا بھی آغاز کردیا تھا۔ بیان سرفروشی اور سنت خیرالانام، اسی دور میں تحریر کیں۔ وہ ڈائری بھی لکھتے تھے ان کی ڈائری میں روز مرہ کے معمولات اور اس وقت کے حالات وواقعات پر تبصرے موجود ہیں(۱۸) پیر صاحب نے

جامعہ ازہر میں ایم۔اے کرنے کے بعد جامعہ کے شعبہ تخصص فی القضاء میں ایم۔فل/پی ایچ ڈی کے لیے رجسٹریشن کرائی تھی۔ ان کے مقالہ کا عنوان ''الحدود فی الاسلام'' تھا اور وہ یہ تحقیقی کام ڈاکٹر ایوب علی آف بنگلہ دیش کی زیر نگرانی کر رہے تھے۔(۱۹) لیکن ان کا یہ کام پائے تکمیل کو نہ پہنچ سکا اور وہ یہ کام ادھورا چھوڑ کر وطن واپس آ گئے۔ راقم نے پی ایچ ڈی کے مقالہ کے حوالے سے حافظ احمد بخش سے بذریعہ مکتوب دریافت کیا کہ پیر صاحب کا مقالہ ایم فل/پی ایچ ڈی کہاں ہے؟(۲۰) اس کے جواب میں انہوں نے اپنے مکتوب میں رقم کیا کہ ''قبلہ پیر صاحب کے مقالہ کا اکثر مواد مصر میں ہی رہ گیا تھا۔ مزید اس کے بارے میں پتہ نہیں''(۲۱)

پیر صاحب وطن واپس آنے کے بعد اپنے والد کی تیمارداری میں لگ گئے۔ کچھ وقت ملتا تو دارالعلوم میں زیر تعلیم طلبہ کو اسباق پڑھاتے یا اپنی زمینوں کی دیکھ بال کرتے۔ ۱۹۵۷ء میں ان کے والد کا انتقال ہوگیا۔ جس دن ان کے والد کا چہلم تھا اس دن انہوں نے دارالعلوم محمدیہ غوثیہ، بھیرہ شریف کی نشاۃ ثانیہ کا آغاز کیا۔(۲۲) اور ایسا نصاب متعارف کرایا جو قدیم وجدید علوم کا حسین امتزاج تھا سب سے پہلے انہوں نے ہی اسلامی جمہوریہ پاکستان میں باقاعدہ طور پر اپنی فہم وفراست سے دینی مدارس (اہلسنت) کے لیے عصری تقاضوں کے مطابق دس سالہ نصاب ترتیب دیا۔ اس نصاب میں تفسیر، اصول تفسیر، حدیث، اصول حدیث، فقہ، اصول فقہ، علم منطق، علم الکلام، علم بلاغت، علم صرف، علم نحو کے ساتھ جدید علوم، انگریزی لٹریچر، علم سیاسیات اور علم اقتصادیات کو خصوصی اہمیت دی۔ اس کے علاوہ مختلف بورڈز سے اپنے دارالعلوم کے طالب علموں کو انٹر میڈیٹ، بی اے اور مختلف مضامین میں ایم۔اے کا امتحان دلوانے کا اہتمام کیا اس کے علاوہ ان کے دارالعلوم کے فارغ التحصیل ہونے والے طالب علم مختلف اسکالرشپ کے تحت مزید تحصیل علم کے لیے بیرونی ممالک جانے لگے۔ انہوں نے اپنے دارالعلوم میں تعلیمی ترقی کے ساتھ اخلاقی تربیت کا بھی اہتمام کیا۔

پیر صاحب ایک طرف تو دارالعلوم کے مہتمم تھے اور دوسری جانب روحانی پیشوا بھی۔ چنانچہ انہوں نے تعلیم وتربیت واصلاح ملت کے لیے دونوں مناسب کا استعمال کیا۔ انہوں نے دارالعلوم محمدیہ غوثیہ کی ڈگر پر ملک کے متعدد شہروں اور قصبوں میں مختلف ناموں سے دینی

جامعات قائم کیں۔ ان جامعات سے فارغ التحصیل علماء ملک کے مختلف حصوں اور دنیا کے متعدد ممالک میں دین کی تبلیغ کا فریضہ سرانجام دے رہے ہیں۔

پیر صاحب نے روحانی پلیٹ فارم سے بھی اپنی خدمات پیش کیں اور خانقاہی نظام میں اصلاحات نافذ کیں انہوں نے اپنی خانقاہ سے منسلک افراد کی دینی، روحانی اور معاشرتی سطح پر اصلاح کی کوشش کی، انہوں نے اپنے احباب کو تمام متعلقین کی فہرست تیار کرنے کا مشورہ دیا انہوں نے اپنی خانقاہ سے منسلک افراد کی توجہ اجتماعی مفادات کے حصول کی جانب مبذول کرائی، انہوں نے اپنے اصلاحی مشن کی وضاحت کرتے ہوئے کہا ''اگر ان لوگوں کی اصلاح میں اللہ تعالیٰ نے کامیابی عطا فرمائی تو پھر عام دعوت دی جاسکتی ہے۔(۲۳)

انہوں نے اپنا پلان بتاتے ہوئے کہا کہ ''مندرجہ ذیل پہلو خصوصی اہتمام کے مستحق ہیں: ۱۔صحیح عقائد ۲۔اخلاق حسنہ ۳۔تعلیم ۴۔معاشی حالت ۵۔صحت بدنی(۲۴)

ہمارے مذہبی مدارس میں اسلام کے بنیادی عقائد پر کم اور مخصوص نظریات وفروعی اختلافات پر زیادہ زور دیا جاتا ہے، تعلیم صرف اسناد کے حصول کے لیے رہ گئی ہے اس کا عمل سے تعلق منقطع ہوگیا ہے، پاکستانی معاشرے میں انفرادی طور پر معاش کی فکر کی جاتی ہے لیکن اجتماعی فکر کی ضرورت ہے لوگ اپنے ماتحتوں کو بھول جاتے ہیں پھر بھی چند لوگ ایسے ہیں جو اللہ تعالیٰ کے عطا کردہ فضل وکرم میں دوسروں کو بھی شامل کر لیتے ہیں جس سے ضرورت مندوں کا بھلا ہوجاتا ہے۔

ہمارے مذہبی اور عصری تعلیمی اداروں میں اخلاق حسنہ پر خصوصی توجہ نہیں دی جاتی اور نہ ہی بچوں کے سرپرست اخلاق وآداب سکھاتے ہیں اسلام میں تعلیم کی پہلی سیڑھی ادب واحترام ہے ایک روایت میں ہے کہ ''پہلے ادب سیکھو پھر علم حاصل کرو''۔ جہاں تک صحت کی بات ہے تو اس معاملے میں نہ تو حکومتی سطح پر کوئی خاص اہتمام کیا جاتا ہے نہ تعلیمی اداروں میں طالب علموں کی توجہ اس جانب مبذول کرائی جاتی ہے اور نہ ہی والدین اور سرپرست اپنے بچوں کی صحت پر خصوصی توجہ دیتے ہیں۔ یقیناً پیر صاحب کی یہ فکر لائق داد ہے۔

پیر صاحب مزید کہتے ہیں کہ ''اپنے تمام پیر بھائیوں کو نماز کا ترجمہ، عقائد اور اخلاق